رجسٹرڈ نمبر ایل ۴۶۶

نگار

قیمت فی کاپی ۱۰ار

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دیگئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۶۷۲ صفحات۔ مجلد۔ سات روپیہ آٹھ آنے
(بعہ) علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
یعنی

من و یزداں کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف ۔ معجزہ و کرامت ۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل ۔ طوفان نوح ۔ خضر کی حقیقت مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور ذبان ۔ اہی حسن یوسف کی داستان۔ قارون ۔ سامری ۔ علم غیب ۔ دعا و توبہ ۔ لقمان۔ عالم برزخ ۔ یاجوج ماجوج ۔ ہاروت و ماروت حوض کوثر ۔ امام مہدی ۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۲۴ صفحات ۔ کاغذ سفید و بیز
قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن بیان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین نمونے ملیں گے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپکو نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشا لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ تحقیقانہ تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کسطرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مہربانی فرماکر — یہ پورا صفحہ پڑھ لیجیے

داہنی طرف نشان (X) دیکھ لیجیے

اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا چندہ اس ماہ میں ختم ہوگیا۔ اگر آپ ہندوستان میں ہیں تو آیندہ پرچہ دریعہ وی، پی بھیجا جائیگا لیکن اگر آپ پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ اپنا چندہ چھ روپیہ (پاکستانی سکہ) ہمارے نمایندہ کو حسب ذیل پتہ سے ذریعہ منی آرڈر روانہ کرکے ہم کو اطلاع دیجیے تاکہ نگار جاری رکھا جائے۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی - ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی متصل ہائی اسکول - کراچی

پاکستان کے بہت سے خریدار

ایسے ہیں جن کا چندہ دسمبر ۴۹ء میں ختم ہوگیا تھا اس لئے سالنامہ ان کو نہیں مل سکا ہے، ان کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اپنا چندہ (چھ روپیہ پاکستانی سکہ) ہمارے نمایندہ کو حسب ذیل پتہ پر ذریعہ منی آرڈر بھیجکر ہم کو اطلاع دیدیں تاکہ خریداری جاری رکھی جائے اور سالنامہ سے لیکر اسوقت تک کے تمام پرچے ان کو بھیجدئے جائیں گے۔ آیندہ جن کا چندہ ختم ہو وہ بھی ازراہ کرم اپنا چندہ اسی پتہ پر بھیجتے رہیں۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی۔ متصل ہائی اسکول - کراچی

کراچی، لاہور اور راولپنڈی کے ایجنٹ صاحبان کو مطلع کیا جاتا ہے کہ

جب تک تبادلۂ زر کا مسئلہ طے نہ ہوگا، نگار کے پرچے اور ان کی طلب کی ہوئی کتابیں ان کو ہمارے نمایندوں کے ذریعہ سے پہونچیں گے۔ ازراہ کرم ان کی قیمت ادا کرکے کتابیں ان سے حسب ذیل پتہ پر وصول کرلیا کریں۔

نمایندہ لاہور	نمایندہ کراچی	نمایندہ راولپنڈی
حکیم اقبال حسن صاحب	ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی	قومی کتب خانہ چوک نیا بازار
متصل دربار داتا گنج بخش لاہور۔	۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی۔ متصل ہائی اسکول کراچی	راولپنڈی

پاکستان میں ہماری کتابیں حاصل کرنے کا طریقہ

پاکستانی حضرات خواہ وہ ایجنٹ ہوں یا نگار کے خریدار یا دوسرے کرمفرما ہماری کتابیں اس طرح حاصل کرسکتے ہیں کہ وہ اپنی مطلوبہ کتابوں کی فہرست ہمارے پاس بھیجدیں، ہم کتابیں ان کو ذریعہ رجسٹری بھیجدیں گے اور وہ ان کی قیمت ہمارے حسب ذیل نمایندوں میں سے کسی کو دست بدست دیدیں گے یا ذریعہ منی آرڈر بھیجدیں گے۔ ۱۔ ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی۔ ۲۲۲ - پیر الٰہی بخش کالونی متصل ہائی اسکول کراچی۔
۲۔ حکیم اقبال حسن صاحب متصل دربار داتا گنج بخش لاہور۔ ۳۔ کتب خانہ چوک نیا بازار۔ راولپنڈی۔

چند بہترین ناول

بم کا نسخہ (جاسوسی) قاضی عدیل احمد عباسی۔ دو روپیہ آٹھ آنہ
جرنیلک کامل (نادر) انعام اللہ خاں ..... بارہ روپیہ
دختر سمرنا (خالدہ ادیب) ..... دو روپیہ
درد۔ (احمد حسین خاں) ..... دو روپیہ آٹھ آنہ
سرخ حرف (۰) ..... ایک روپیہ آٹھ آنہ
سنہری لاش۔ (تیرتھ رام) ..... پانچ روپیہ
سنہری بچھو۔ (〃) ..... پانچ روپیہ
آفتاب۔ (نصیر حیدر) ..... ڈیڑھ روپیہ
شاہی ڈاکو۔ (شیوبرت لال) ..... ڈیڑھ روپیہ
شباب لکھنؤ۔ (منشی احمد علی) ..... ڈیڑھ روپیہ
طاہرہ۔ (شرر لکھنوی) ..... ڈیڑھ روپیہ
فل بوٹ۔ (عظیم بیگ چغتائی) ..... ڈیڑھ روپیہ
شریر بیوی (〃) ..... ڈھائی روپیہ
قاتل ہار۔ (تیرتھ رام) ..... پانچ روپیہ
کرنی کا پھل۔ (ریاض دہلوی) ..... دو روپیہ
کرنیل کی بیٹی۔ (تیرتھ رام) ..... تین روپیہ آٹھ آنے
کنوار، دو حصے (شفیع خاں نیر) ..... ڈھائی روپیہ
لفٹنٹ۔ (عظیم بیگ چغتائی) ..... ایک روپیہ
مصنوعی انسان۔ (تیرتھ رام) ..... ایک روپیہ چار آنہ
مہر خموشی۔ (تیرتھ رام) ..... تین روپیہ آٹھ آنہ
نظیر بیگم۔ (احمد حسین خاں) ..... ایک روپیہ
ہوائی۔ (سلطان حیدر جوش) ..... ڈھائی روپیہ

ملنے کا پتہ:- دفتر نگار لکھنؤ

کیل
چھائیوں
پھوڑے
پھنسیوں
نجات
پانے
کیلئے

صافی

استعمال کیجئے

قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ ہر جگہ بکتی ہے

ہمدرد دواخانہ وقف دہلی

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہازی کمپنی)

حج سروس

مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ سالِ رواں کے حج کے لئے رمضان کے بعد اپنے پہلے چار جہازوں کی روانگی کا اعلان کرتی ہے۔

ایس - ایس - "محمدی" - ۷۰۲۲ ٹن

۲۰ر جولائی سنہ ۱۹۵۰ء کو بمبئی سے روانہ ہوگا

ایس - ایس - "اکبر" - ۷۰۴۰ ٹن

۲۱ر جولائی سنہ ۱۹۵۰ء کو بمبئی سے روانہ ہوگا

ایس - ایس - "اسلامی" - ۵۸۷۹ ٹن

۲۲ر جولائی سنہ ۱۹۵۰ء کو بمبئی سے روانہ ہوگا

ایس - ایس - "علوی" - ۳۵۶۶ ٹن

۲۵ر جولائی سنہ ۱۹۵۰ء کو بمبئی سے روانہ ہوگا

جہاز کا کرایہ (خوراک کے ساتھ)

بمبئی / جدہ واپسی

درجہ اول ۱۱۰۵ روپے

عرشہ (ڈیک) ۳۹۸ روپے

ان کرایوں میں قرنطینہ کا مران، حفظانِ صحت، جدہ کے محاصل اور کشتی کا کرایہ شامل نہیں، جن کی مجموعی رقم ۴، روپے ۱۲ر آنے ہوتی ہے۔
عازمین حج کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے گھروں سے روانہ نہ ہوں جب تک کہ کمپنی انھیں بمبئی آنے کے لئے نہ لکھے۔
حاجیوں کو ان کی اپنی سہولت کے خیال سے مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ہیضہ اور چیچک کے ٹیکے اپنے وطن ہی میں لگوالیں اور اپنے ہاں کے محکمہ صحت کے سرکاری افسر سے انٹرنیشنل فارموں پر ان کی تصدیق کرالیں۔
کرائے کی رقم بمبئی میں ٹکٹ خریدتے وقت ہی ادا کی جائے۔ کوئی صاحب ڈاک کے ذریعہ روپیہ نہ بھیجیں۔

ٹرنر مارین اینڈ کمپنی لمیٹڈ
مینجنگ ایجنٹس
دی مغل لائن لمیٹڈ
۱۶، بنک اسٹریٹ بمبئی

تار کا پتہ
MOGUL
BOMBAY.

اب بھی وقت ہے

کہ آپ "من و یزداں" کے دونوں حصے
تیرہ روپیہ میں معہ محصول حاصل کرسکیں گے۔

ورنہ

غالباً دو ماہ کے بعد آپ کو یہ کتاب کسی قیمت پر نہ مل سکے
کیونکہ اب صرف ۱۰۰ نسخے اس کے باقی رہ گئے ہیں اور
آیندہ اتنی بڑی کتاب کا چھپنا آسان نہیں۔

"من و یزداں"

ایک صحیفۂ انسانیت ہے جس کے مطالعہ کے بغیر آپ مذہب
کی صحیح روح نہیں سمجھ سکتے۔ منیجر نگار لکھنؤ

رعایتی قیمت

"مجموعۂ استفسار و جواب"

کی تیسری جلد

ضخامت ۵۰۰ صفحات

جس کی قیمت علاوہ محصول تین روپیہ ہے
لیکن اب آپ کو معہ محصول صرف دو روپیہ میں
مل سکتی ہے۔ منیجر نگار لکھنؤ

اپنے ذوق کی کوئی کتاب پسند کر لیجئے

چند ڈرامے - (نور الٰہی محمد عمر) - - ڈیڑھ روپیہ
حاشئے - - - - (فراق) - - - ایک روپیہ بارہ آنے
حیات خسرو - - (سعید مارہروی) ایک روپیہ آٹھ آنہ
بیان خسرو - (شبلی) - - - - - - - ایک روپیہ
خیالات (مضامین مرزا سلطان احمد) - تین روپیہ
راجپوت مغل زن و شو - (صمدنی) تین روپیہ بارہ آنہ
رمز و کنایات (مجموعۂ کلام فراق) پانچ روپیہ آٹھ آنہ
روپ - (فراق کی رباعیاں) - - پانچ روپیہ آٹھ آنہ
سفر نامہ برما (ابو ظفر ندوی) - - - ڈھائی روپیہ
سیر گل (افسانے) جلیل قدوائی - - - - دو روپیہ
سیرت آلِ عباس (فرید احمد عباسی) - دو روپیہ
سیرت احمد - (خان احمد حسین خاں) - تین روپیہ
سیرت رسول اللہ (پروفیسر نواب علی) چار روپیہ آٹھ آنہ
شمستان - (مجموعہ کلام فراق گورکھپوری) - - چھ روپیہ
رباعیات شاد عظیم آبادی - - - - - - - چار روپیہ
تاریخ جوناگڈھ (مصور) - - - - - پندرہ روپے
نظام اُردو - (آزاد لکھنوی) - - - - ڈیڑھ روپیہ
نفحات العنبر یہ (تذکرہ صوفیا) - - - - پانچ روپیہ
مطلع الانوار (کلیات برق دہلوی) - - - ڈیڑھ روپیہ
معجزۂ قرآن مجید (ادریس احمد) - - - - دو روپیہ
مغز لغز (انتخاب مثنوی روم) - - - دو روپیہ آٹھ آنہ
مکاتیب (وقار الملک) - - - - ایک روپیہ آٹھ آنہ

ملنے کا پتہ :- دفتر نگار لکھنؤ

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۵۸) | فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۵۰ء | شمار (۱)

ملاحظات ---------- ۵
دورِ جدید کی شاعری اور گیت ... بسم اللہ بیگم ---- ۹
انیس کی مرثیہ نگاری ... مرزا جعفر علی خاں اثر ... ۱۹
عہدِ زار سے اسٹالین تک ... نیاز فتحپوری ---- ۳۰
اشارات ---------- خیر بہوروی ---- ۳۹
شامی زبانیں اور ان کا رسم خط ... عبدالمالک آروی ... ۴۳
اقبال کے خطوط عطیہ فیضی کے نام ... شبلی بی کام ---- ۴۹
یہاں وہاں سے ۵۵
ساقی (نظم) ---- پروفیسر شور ---------- ۵۷
اُردو ---------- جگن ناتھ آزاد ---------- ۵۹
منظومات ... قہر اکبرآبادی - ناز بریلوی - مشیر جھنجھانوی - شمیم نعمانی ... ۶۰
مطبوعات موصولہ ---------- ۶۱-۶۴

ملاحظات

اب کیا ہونا چاہئے

یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ نہرو لیاقت پیکٹ کے بعد، دونوں حکومتوں کے پرمیئر باہر چلے گئے اور اس طرح دُنیا کو اس پیکٹ کے صحیح نتائج پر غور کرنے کا موقعہ مل گیا۔

اس پیکٹ کے بعد بھارت و ہندوستان کی ذہنیت میں جو تبدیلی پیدا ہوئی ہے، وہ اگر ان دونوں کی موجودگی میں ہوتی تو شاید اس کو ان کے ذاتی اثرات کا نتیجہ سمجھا جاتا، لیکن چونکہ یہ ان کی غیبت میں ہوئی ہے، اس لئے ماننا پڑے گا کہ اب پبلک بھی خود محسوس کرنے لگی ہے کہ دونوں ملکوں کی نجات اتحاد و خلوص ہی سے وابستہ ہے اور معاندانہ اسپرٹ کو اب ختم ہو جانا چاہئے۔

بھارت کے اخباری نمایندوں کا وفد جو پاکستان گیا تھا، واپس آگیا ہے اور اس نے وہاں جو کچھ دیکھا اس کا حال وفد کے صدر کی زبان سے ہم آپ سب سن چکے ہیں، اس لئے اب بھارت کے باشندوں کو یقین کر لینا چاہئے کہ پاکستان نے دوستی کا جو ہاتھ آگے بڑھایا ہے وہ محض نمود و نمایش نہیں ہے بلکہ وہ ایک حقیقت ہے جس کا جواب انھیں بھی اس کے خلوص و صداقت ہی سے دینا چاہئے۔

ہم کو نہیں معلوم کہ پنڈت نہرو اور نواب زادہ لیاقت علی خاں اپنی واپسی کے بعد اس سلسلہ میں دوسرا قدم کیا اُٹھائیں گے۔ لیکن یہ

یقینی ہے کہ وہ پھر ملنے کی جلد کوشش کریں گے اور ان تمام گتھیوں کو سلجھائیں گے جو دونوں ملکوں کے لئے دردسر بنی ہوئی ہیں۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ جس کے فیصلہ پر ان دونوں ملکوں کے تعلقات کا انحصار ہے، کشمیر کا مسئلہ ہے، اور ہم سمجھتے ہیں کہ پنڈت نہرو اور نوابزادہ کی واپسی کے بعد سب سے پہلے اس پر گفتگو ہوگی اور نئے ثالث بھی اس میں حصہ لیں گے۔ لیکن یہ توقع کرنا کہ وہ جلد یا آسانی سے طے ہو جائے گا، صحیح نہیں۔ اس لئے اس کے فیصلہ کے انتظار میں دوسرے مسایل کو التوا میں ڈالنا مناسب نہ ہوگا اور ان پر غور کرنے کے لئے دونوں صدر یقیناً پھر ملیں گے۔

ان میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ تخلیہ کنندگان کی جایداد کا ہے اور اس وقت تک باہمی گفتگو کا یہ خوشگوار نتیجہ تو ضرور پیدا ہوا ہے کہ جایداد منقولہ کی علیحدگی کی اجازت ان کو دیدی گئی ہے، لیکن جب تک غیر منقولہ جایداد کی فروخت یا باہمی تبادلہ کی عام اجازت نہ دیدی جائے اس گتھی کا سلجھنا مشکل ہے۔

اس سے قبل کی تخلیہ کنندگان کی جایداد کا جھگڑا بالکل علیحدہ چیز ہے اور اُس کو آیندہ کے سمجھوتہ پر موثر نہ ہونا چاہئے۔ ضرورت ہے کہ فضا کو زیادہ خوشگوار بنانے کے لئے دونوں ملکوں کی اقلیتوں کو اجازت ہونا چاہئے کہ وہ خود جا کر اپنی جایدادوں کی موجودہ حالت کو دیکھیں اور جس کے ہاتھ چاہیں فروخت کر دیں یا تبادلہ کر لیں۔

دوسری بات جو کم اہم نہیں ہے، پرمٹ سسٹم ہے، اس کو بالکل اُٹھ جانا چاہئے تاکہ لوگوں کو اِدھر اُدھر جانے اور ایکدوسرے سے تبادلۂ خیالات میں آسانی ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ریل کی براہ راست آمد و رفت پھر شروع کر دی جائے۔ اس سے ایک فایدہ تو یہ ہوگا کہ جو کشیدگی آپس میں پیدا ہو گئی ہے وہ ایک دوسرے سے ملنے کے بعد دور ہو جائے گی اور دوسرا یہ کہ تجارتی تعطل بھی ایک حد تک ختم ہو جائے گا۔

تیسری چیز تبادلۂ زر کا مسئلہ ہے، تقریباً ایک سال ہوا کہ اس مسئلہ کے طے نہ ہونے کی وجہ سے روپیہ کی منتقلی دونوں طرف بند ہے اور اس طرح تجارت کا وہ سلسلہ جو وی پی اور منی آرڈر کے ذریعہ سے قایم تھا بالکل ختم ہو گیا ہے۔ بہت سے خاندان بھارت میں ایسے ہیں جن کو ان کے پاکستانی اعزہ کے پاس سے روپیہ آتا تھا اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ اسی طرح پاکستان میں بھی بہت سے خاندان ایسے ہیں جن کو بھارت سے روپیہ جاتا تھا، لیکن اب منی آرڈر کی روانگی بند ہونے کی وجہ سے انھیں سخت تکلیف ہے۔

اسی طرح تجارتی اشیاء میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اِدھر سے اُدھر وی پی کے ذریعہ سے جاتی تھیں، لیکن اب یہ سلسلہ بھی ستمبر سے بند ہے اور اس طرح چھوٹے تاجروں کو بہت نقصان پہونچ رہا ہے، جس کو گورنمنٹ شاید اس لئے محسوس نہیں کرتی کہ براہ راست اس کا اس نوع کی تجارت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حالانکہ انھیں غور کرنا چاہئے کہ اس طرح جو اقتصادی دشواریاں عام پبلک کے لئے پیدا ہو گئی ہیں، ان کا اثر جلد یا بدیر حکومت پر بھی پڑتا ہے اور پایان کار وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ الغرض نہرو لیاقت پیکٹ کے بعد جو فضا پیدا ہو گئی ہے وہ بہت امید افزا ہے اور اگر درمیان میں کوئی اور پیچیدگی نہ پیدا ہو گئی، تو خیال یہی ہے کہ دونوں ملکوں کے موجودہ خوشگوار تعلقات زیادہ دیرپا اور دور رس ثابت ہوں گے۔

کیا کوریا کی جنگ تیسری عالمگیر جنگ کا پیش خیمہ ہے

کوریا میں آتش جنگ بھڑک اُٹھنے سے بعض لوگوں کو یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں یہ تیسری عالمگیر جنگ کی بنیاد نہ ہو۔ اس میں شک نہیں کہ روس و امریکہ کے درمیان جو کشیدگی پائی جاتی ہے، اس کو دیکھ کر یہ اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ فی الحال یہ اندیشہ صحیح نہیں ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ شمالی کوریا، روس کے زیر اثر ہے لیکن روس کے مقبوضات میں شامل نہیں ہے، اس لئے اس کا جنوبی کوریا پر حملہ کرنا (جو امریکہ کے زیر اثر ہے) روس کا امریکہ پر حملہ کرنا نہیں ہے اور امریکہ بھی اسکو اس روشنی میں نہیں دیکھتا۔ لیکن امریکہ اس جنگ میں جس دلچسپی سے کام لے رہا ہے اس سے ایک بات بالکل واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ کہ بحر پاسفک میں اب وہ اشتراکی اثرات کو زیادہ بڑھنے نہ دے گا اور اگر اس کے لئے اسے جنگ کرنا پڑی تو وہ اس سے بھی دریغ نہ کرے گا۔ اس مسئلہ میں سب سے پہلے بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "کیا روس، امریکہ کے خلاف جنگ کی طیاریاں کر رہا ہے"۔

خود روسی لیڈروں کا کیا خیال ہے، اس کو تو وہ خود ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں، لیکن روس کی پچھلی تاریخ، وہاں کے موجودہ حالات اور نفسیاتی رجحانات کو سامنے رکھ کر ضرور ہم کسی نہ کسی نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں۔

لینن نے ایک بار یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "سوویٹ جمہوریت اور شہنشاہی حکومتوں کا میل عرصہ تک قایم رہنا ناقابل تصور امر ہے، اسلئے ایک نہ ایک دن ان میں سے کسی ایک کا دوسرے پر چھا جانا ضروری ہے اور اس ساعت کے آنے سے قبل دونوں میں بار بار تصادم ہونا بھی لازم ہے"۔ لیکن اسٹالین کا موجودہ نظریہ اس کے خلاف ہے اور وہ لڑائی نہیں چاہتا۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ لڑائی سے ڈرتا ہے بلکہ محض یہ کہ اسے یقین ہے سرمایہ داری کو آخر کار خود اپنے بوجھ سے ہلاک ہو جانا ہے اور کمیونزم کا کام صرف یہ ہے کہ وہ سرمایہ داری کو ہلاکت سے قریب تر کر دے اور یہ کام افواج کا نہیں بلکہ ان کمیونسٹ جماعتوں کا ہے جو تمام ملکوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلے تو کمیونزم نے روس کو بدلا تھا اور اب روس کمیونزم کو بدل رہا ہے۔ روس کی پچھلی روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پالیسی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ صرف وقت و حالات سے فایدہ اُٹھا کر اپنی حدود کو وسیع کرے اور جہاں تک ممکن ہو لڑائی سے بچے۔

روس بہت بڑا زراعت پیشہ ملک ہے اور وہاں کے لوگوں کی عام ذہنیت کاشتکارانہ ہے۔ لیکن چونکہ اقتصادی و میکانکی پستی کی وجہ سے وہ آس پاس کی غیر ملکی زمینوں پر لڑ بھڑ کر قبضہ نہیں کر سکتے بلکہ صرف اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی موقعہ ملے اور وہ اس پر کسی ترکیب سے قابض ہو جائیں زار شاہی حکومت کے زمانہ میں بھی ہمیشہ یہی ہوا کہ اندرون ملک کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر آہستہ آہستہ قبضہ کر کے حدود سلطنت کو بڑھایا جاتا رہا یہاں تک کہ وہ اتنی وسیع سلطنت ہو گئی۔ اس جنگ کے بعد بھی مشرقی یوروپ کی متعدد حکومتوں پر روس کا اقتدار وہی موقعہ و محل سے فایدہ اُٹھانے کی بات تھی۔ گو یہ کہنا مشکل ہے کہ اس نوالہ کو روس اچھی طرح چبا سکے گا یا نہیں۔

اسی کے ساتھ جب خود روس کے اندرونی حالات پر غور کیا جاتا ہے تو بھی ہم اسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ وہ جنگ کا موافق نہیں ہو سکتا پچھلی لڑائی کو ختم ہوئے تقریباً ۵ سال کا زمانہ گزر چکا ہے، لیکن اس کے تباہ کن اثرات وہاں ہنوز باقی ہیں اور باوجود انتہائی کوشش

کے وہاں کے حالات اعتدال پر نہیں آئے اور نہ شاید اس قدر جلد آسکیں۔ علاوہ اس کے روس کے سامنے صرف یہی سوال نہیں ہے کہ تباہ شدہ علاقوں کو اپنی اصلی حالت پر لے آئے، بلکہ وہ صنعتی ترقی کی اسکیموں کو بھی بروئے کار لا رہا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے بھی کافی زمانہ چاہئے۔

الغرض روس کی موجودہ حالت اور اس کی پالیسی کا اقتضاء یہ نہیں ہے کہ وہ کسی سے لڑائی مول لے اور اگر شمالی کوریا نے یہ حملہ اس امید پر کیا ہے کہ روس بھی اس کی حمایت میں اعلان جنگ کردے گا، تو اس کا یہ خیال غلط ہے اور وہ اپنی اس غلطی کو جلد محسوس کریگا

پچھلی جنگ میں جب جاپان کو شکست ہوئی تو ۴۵ء میں کوریا کو بھی اُس کی غلامی سے نجات ملی، لیکن اس صورت سے کہ شمالی حصہ پر روس کا قبضہ ہوگیا اور جنوبی حصہ پر امریکہ کا۔ اور آپس میں یہ بات طے پائی کہ پانچ سال کے بعد کوریا کو بالکل آزاد کردیا جائے گا۔ چند دن بعد روسی حکومت نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہاں ایک عارضی حکومت قایم کردیجائے اور روس و امریکہ کا ایک مشترک کمیشن اس کی تفصیلات طے کرے، لیکن اس کمیشن کے ممبروں میں اختلاف رائے ہوگیا اور یو۔ این۔ او نے دوسرا کمیشن مقرر کیا اور یہ بھی بدقسمتی سے کامیاب نہ ہوا اور مجبوراً ایک عارضی حد فاصل قایم کرکے شمالی کوریا کو روس کے زیر اثر دیدیا گیا اور جنوبی کوریا کو امریکہ کے۔ تین سال کے بعد روس و امریکہ دونوں نے اپنی اپنی فوجیں وہاں سے ہٹالیں لیکن روس اپنے ٹینک اور ہوائی جہاز شمالی کوریا میں چھوڑ گیا اور امریکہ کا فوجی مشیر جنوبی کوریا میں بدستور ٹھہرا رہا۔ گویا کوریا جسے حسب قرارداد ۵۰ء میں آزاد ہوجانا چاہئے تھا، بدستور روس و امریکہ کے درمیان استخوان جنگ بنا رہا اور دونوں حصوں کے باہمی تعلقات رفتہ رفتہ اس قدر خراب ہوگئے کہ آخرکار دونوں میں جنگ چھڑ گئی۔

شمالی کوریا اس کا ذمہ دار جنوبی کوریا کو قرار دیتا ہے اور جنوبی کوریا، شمالی کوریا کو، لیکن سچ پوچھئے تو اس کی ذمہ داری براہ راست روس و امریکہ پر عاید ہوتی ہے جن میں سے ہر ایک بحر بالسفک میں اپنا اقتدار قایم رکھنا چاہتا ہے۔

اس وقت تک کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی کوریا کی فوجیں آگے بڑھتی جارہی ہیں لیکن یہ غالباً اسی وقت تک ہے جب تک امریکی فوجیں وہاں نہیں پہونچ جاتیں۔ اس کے بعد یقیناً ہوا کا رخ بدلیگا اور شمالی کوریا کی فوجوں کو پسپا ہونا پڑے گا، اگر روس نے اپنی فوجیں بھیج کر اس جھگڑے کو تیسری عالمگیر جنگ میں تبدیل نہ کردیا ـــــ بعض کا خیال ہے کہ روس کا امریکہ کے مقابلہ میں آنا ناگزیر ہے ورنہ ایشیا میں اس کی ساکھ ختم ہوجائے گی، لیکن میری رائے یہ ہے کہ وہ اس اقدام کے لئے فی الحال طیار نہیں ہے، خاصکر ایسی صورت میں جبکہ تمام دُنیا کی حکومتیں (چند کے سوا) امریکہ کے ساتھ ہیں۔ علاوہ اس کے یہ جنگ ایسی جگہ ہورہی ہے جہاں امریکہ اپنی تمام فوجی طاقت نہایت آسانی سے فراہم کرسکتا ہے اور روس ایسے دور دراز مقام پر اپنی فوجوں کو آسانی کے ساتھ نہیں بھیج سکتا بہرحال اگر امریکہ کا اقدام تادیبی کارروائی سے آگے نہ بڑھا تو امید ہے کہ فیصلہ جلد ہوجائے گا اور اگر بدقسمتی سے روس نے بھی اعلانِ جنگ کردیا تو پھر یہ آگ دفعتاً یوروپ و ایشیا ہر جگہ پھیل جائے گی اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

دورِ جدید کی شاعری اور گیت

اُردو شاعری کا کارواں مختلف مراحل طے کرتا ہوا ہمارے زمانہ تک آن پہونچا ہے اور اس دور سے گزرنے والے شعراء اپنا اپنا راستہ ٹٹول کر آگے بڑھ رہے ہیں ہماری شاعری دوراہے نہیں بلکہ تراہے پر کھڑی ہوئی ہے۔ کچھ غالب، مومن کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنا چاہتے ہیں۔ کچھ اقبال کے اندازِ فکر سے متاثر ہیں اور کچھ عظمت اللہ خاں کی تحریک کو فروغ دے رہے ہیں۔ ان سب کو راستہ ٹٹول ٹٹول کر چلنے والے اس لئے کہا گیا کہ حسرت۔ جگر۔ فانی جیسے بزرگوں کو چھوڑ کر جو اپنی وفاداری اور استواری کی وجہ سے بجائے کاشی کے کعبہ کے مستحق ہو جاتے ہیں، شاید ہی کوئی اور ایسا شاعر ہو جو اس کی تلاش میں ہر پھول پر نہ بیٹھا ہو۔ زیادہ تر ایسے ہیں جن کے یہاں غزلیں نظمیں اور گیت سب کچھ ملے گا۔

ان میں سے کچھ اپنے نصب العین کو پا چکے ہیں اور کچھ کو ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ کچھ کے مجسمے ناتمام ہیں۔ کچھ کے مجسمے بن چکے ہیں لیکن ان میں آرٹ کی روح جلوہ گر نہیں ہوئی اس لئے ان کے دبستان قایم کرنا اور اس حیثیت سے انھیں زیرِ بحث لانا ان شاعروں کے ساتھ ناانصافی بھی ہوگی اور کوئی خاص فایدہ بھی مترتب نہیں ہوگا۔ ان شعرا میں باستثنائے ترقی پسند شاعروں کے اور وہ بھی معنوی حیثیت سے (صوری اعتبار سے نہیں) کوئی گروہ بندی قایم نہیں ہو سکی ہے۔ وہ سب بکھرے بکھرے سے ہیں۔ ان جواہرات کو کسی جوہری نے الگ الگ پرکھ کر ڈھیریوں میں تقسیم نہیں کیا۔ وہ سب منتشر ہیں۔ اس انتشار کا باعث کچھ وہ معنوی محرکات ہیں جو ہمارے زمانہ کے روحانی، ذہنی، سماجی اور سیاسی اقدار کے اختلاف پر مبنی ہیں اور کچھ وہ صوری نقش ہیں جو خارجی شاعری کو غزل اور گیت کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔

غزل، مثنوی اور مسدس کے ڈھلے ڈھلائے سانچے موجود تھے۔ ان میں تخیل یا جذبہ کو بھر دینا کچھ مشکل کام نہیں تھا گیت کے سانچے برابر طیار ہو رہے ہیں اور ان میں عظمت اللہ کی تحریک بار آور ہو رہی ہے۔ بحروں کی وسعت۔ الفاظ کا ترنم۔ اسلوب کی ندرت اور اختراع۔ آزاد روی۔ ردیف و قافیہ سے بغاوت۔ غرض اس ظاہری بے ضابطگی اور انتشار میں وہ حسن کے اور پہلو تلاش کر رہے ہیں۔ اس میں ٹیگوریت بھی ہے اور مغربیت بھی۔ فنی اعتبار سے اقبال کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے فلسفۂ خودی سے متاثر ہو کر اُردو شاعری نے پست قنوطیت کا جامہ اُتار پھینکا۔ ہندوستان میں زندگی اور اس کے مترادف لفظ شباب نے پھر ایک بار پیری لی اور پیرِ اقبال کا مرید جوش سب سے پہلا شاعر ہے جو شعوری طور پر سمجھتا ہے یا کہتا ہے کہ:-

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب میرا نعرہ انقلاب و انقلاب

جوش موجودہ دور کے شعراء کے امام سمجھے جاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان میں امام کی سی فن کارانہ خطابت ہے۔ وہ جلیل القدر اور پُرجوش ہیں۔ شاید اسی لئے کہ ان کی زبان میں حُسن و طمطراق ہے۔ ان میں تشبیہیں۔ استعارے اور تراکیب کی مرصع کاری ہے۔ بلند آہنگی ہے، قائدانہ عزم و بے باکی ہے لیکن ٹھیک انھیں وجوہ کی بناء پر وہ شعراء کے امام وقت ہوں تو ہوں لیکن عوام کے شاعر نہیں ہو سکتے۔ ان کی آواز اس محدود طبقہ تک پہونچ کر رک جاتی ہے جو نہ انقلاب کے لئے طیار ہے نہ جس میں انقلاب کی اہلیت ہے اور نہ انقلاب سے اسے فایدہ۔ وہ جانتا ہے کہ پیغام پر بننے سے زیادہ جوش یہ چاہتے ہیں کہ دنیا انھیں پیغامبر سمجھے، اور جوش و خروش اور انقلاب کے نعروں سے انکا کلام گونج رہا ہے لیکن انقلاب کیا ہے نظام جدید سے کیا مطلب ہے اس سے انھیں بحث نہیں، انھیں تو غارت گری سے مطلب ہے۔ ان چیزوں میں ان کی حالت ایک مشتعل مزاج تماشائی کی سی ہے جس پر بیتتی ہے اور اپنے اصول کی خاطر سب کچھ تج دیتا ہے اور طرح طرح کے عذاب اور اذیتیں سہتا ہے اس کی آواز کچھ اور ہوتی ہے" ان کی آواز عوام کے شاعر کی آواز نہیں، ان کے یہاں غصّہ و غضب ہے۔ شباب کا جوش ہے۔ حسن کی خیرہ نگاہی۔ عشق کا ہنگامہ خیز تموج ہے منظر نگاری ہے۔ وطن کی آزادی کی پکار ہے لیکن وہ سب خارجی حیثیت سے ہے داخلیت مفقود ہے۔ " وہ استعارات[1] و تشبیہات سے کھیلتے ہیں۔ الفاظ کے ہجوم سے جوش و گرمی پیدا کرنا چاہتے ہیں مگر چونکہ ان کا خیال مسلسل مربوط اور گہرا نہیں ہوتا اس لئے ان کی نظمیں وقتی اور ہنگامی کی حد سے آگے نہیں بڑھتیں"۔ انکی شاعری میں پروپاگنڈا ہے۔ اس لئے گیتوں کی دنیا میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ سوا اس کے کہ بعض موجودہ گیت لکھنے والے ان سے متاثر ہوئے۔ چونکہ موجودہ شعرا میں سے بعض گیت لکھنے والوں نے اپنے گیتوں کے موضوع ایسے رکھے ہیں جو پروپاگنڈے کی تعریف میں آسکتے ہیں اس لئے چند باتیں شاعری اور تبلیغ کے سلسلہ میں بیان کرنا ناگزیر سا ہے۔

اصل میں موجودہ شعراء پر تنقید کرنا کچھ قبل از وقت سی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ادل تو ان کی شاعری تکمیل کے مرحلے طے کر رہی ہے اور مکمل نقش نہیں بنی دوسرے ہم میں اور ان میں زمانہ کا وہ فصل پیدا نہیں ہوا جو ہماری تنقید کو بے لاگ، بے لوث اور عصبیت سے الگ ہو کر پرکھنے میں معاون ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید شاعری کا مقصد عوام کو اشتراکیت کی تعلیم دینا سیاست کے میدان میں اپنا اقتدار پیدا کرنا اور ایک سرخ حکومت قایم کرنا ہے۔ حالانکہ ان کے گیتوں میں یہ مقصد اس صفائی اور وضاحت سے نظر نہیں آتا اور جہاں ہے وہاں گیت معیاری نہیں رہے۔ یہ بحث شاعری اور اس کے موضوعات کی بحث کو پھر سامنے لے آتی ہے۔ اس کے متعلق جتنا ضروری تھا لکھا جا چکا ہے

---

[1] آل احمد صاحب سرور " جدید اُردو شاعری کے بعض میلانات" جامعہ۔ جولائی

لیکن مختصراً عادہ کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نظمیں مقصدی ہیں گیت نہ جب مقصدی تھے نہ اب۔ اگر مقصد سے مراد کسی خاص مسلک کی تبلیغ ہو ورنہ خط حاصل کرنا بھی ایک مقصد ہو سکتا ہے۔ رہا اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے موضوع کا انتخاب تو اس میں زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی۔ ماحول کے نقوش۔ انسان کے قلبی واردات، نفسیاتی محرکات۔ اس کے افعال۔ ذوق۔ وجدان۔ ذہنی کیفیات۔ دل چسپیاں۔ خیالات و جذبات کی کشمکش۔ ان موضوعات کا وقتی اور ہنگامی یا ابدی ہونا شاعر کی تخیلی پیکروں کی تخلیق اور انداز بیان پر بھی موقوف ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ موجودہ شعرا جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ آزادی حاصل ہونے کے بعد سب کا سب مٹ جائے گا۔ ان میں کافی چیزیں ایسی ہیں جو انمٹ ہیں۔

یہ جملہ معترضہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ گیتوں کے موضوعات معدودے چند کو چھوڑ کر اب بھی وہی ہیں جو نظیر اور عظمت اللہ خاں کے یہاں ملتے ہیں۔ حسن و عشق کے کرشمے۔ قلبی محسوسات۔ موسم کی رنگینیاں۔ زندگی کی ترجمانی۔ اسلوب بیان اور طرز ادا میں گیت نظیر اور عظمت اللہ خاں کے سہارے پھر وہیں آ گئے ہیں جہاں سے غزل انھیں چھوڑ کر الگ ہو گئی تھی۔ گیتوں کا ماحول بھی خالص ہندوستانی ہے اور ہندوستان کے سماج کی عکاسی کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ گھریلو گیتوں کے مقابلہ میں زیادہ سڈول معلوم ہوتے ہیں، لیکن تراش خراش مصنوعی باغ کی سی تراش خراش نہیں بلکہ کسی دریا کے کنارے اس کی موجوں کے ہم آغوش ایک گھاٹ بنا لیا جائے جہاں انسان فطرت کے حسن سے دور بھی نہیں ہوتا لیکن ساتھ ساتھ معمارانہ چابک دستی سے جا بھی حاصل کرتا ہے، گیتوں کا سڈول پنا کچھ اسی قسم کا ہے۔ اس معمارانہ چابک دستی کا نام ادبیت ہے۔ ٹھوس اور مغلق ادبیت نہیں بلکہ لطیف اور شیریں گیتوں میں اب اسلوب کی خوبیاں بھی نظر آئیں گی، تشبیہ و استعارہ میں تاثر۔ ندرت۔ سادگی اور پرکاری بھی ملے گی۔ دیہات میں گھریلو گیتوں کی کھڑی بولی۔ نظیر کی زبان کی اجنبیت اور عظمت اللہ خاں کے نقش اول کا کھردرا پن مٹ چکا ہے زبان دیہاتی اور شہری۔ پڑھے لکھے اور بغیر پڑھے لکھے مرد اور عورت سب کے لئے مانوس اور میٹھی بولی ہے۔ عروضی شکلیں کچھ متعین ہو گئی ہیں کچھ ہو رہی ہیں بلکہ حقیقت کچھ یوں ہے کہ لوگ فیض احمد فیض اور ن۔م راشد کی بے راہ روی اور 'گمراہی' سے خوفزدہ ہو کر گیتوں کے اصناف عروضی کو سند قبول دینے کے لئے طیار ہیں اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عروض میں عظمت اللہ خاں کے وقیع تجربے اور انکا نقطۂ نظر صوری اعتبار سے اس دور کی شاعری پر کارفرما ہے۔

اقبال کی آواز ہاتف غیبی کی آواز کی طرح بلند آہنگ اور زوردار تھی لیکن اس میں نرمی اور ملائمت بھی تھی اس لئے گراں نہ ہوتی تھی، جوش کے نعرہ میں شیر کی دھاڑ تھی جس نے سراسیمگی اور تحیر پیدا کر دیا۔ سیماب کی شاعری ہاتھی کی چنگھاڑ کی طرح فضا میں گونجی لیکن دل میں نہ اتر سکی۔ وجہ یہ تھی کہ جوش اور سیماب دونوں نے غزل کی دلہن کو مرد کا لباس

۱؎ کلیم الدین - اردو شاعری پر ایک نظر صفحہ ۱۳۴

پہنایا۔ ان کی نظموں اور گیتوں میں پرانے تغزل کی شان ہے۔ غزل اب بھی سہاگن ہے اور خدا اس کا سہاگ قایم رکھے لیکن زمانہ نے ایک نئی دلھن اور پیدا کی، جس کا نام گیت ہے۔

بہزاد — بہزاد لکھنوی بھی اسی قسم کے ایک شاعر ہیں۔ ان کے گیتوں میں بھی حسن و عشق ہے لیکن غزل کا سا۔ قافیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

موہے پریت کی ریت بتا سجنی
میں رنگ محبت کیا جانوں
آغاز کو کیونکر پہچانوں

اس گتھی کو سلجھا سجنی
موہے پریت کی ریت بتا سجنی

بہزاد حزیں افسردہ ہے
مغموم ہے اور پژمردہ ہے

بہزاد کو مست بنا سجنی،
موہے پیت کی ریت بتا سجنی

ان نقوش میں نہ کوئی منفرد جذبہ ہے نہ جذبہ کی اصلیت و شدت اور نہ گیت کوئی مخصوص اثر پیدا کرتا ہے۔ ان میں گیت کا ترنم ضرور ہے اور گیت کی شکل ہے لیکن گیت کی سی شعریت نہیں ہے۔

صوری اعتبار سے وہ گیت ضرور ہیں۔ ترنم ہے الفاظ عام فہم ہیں۔ علامات و اشارات وہی ہیں۔ ساجن، سجنی پریم۔ نیا۔ کوئل۔ کنول۔ بھکاری۔ درشن۔ پپیہا۔ ساون۔ ملن کی رات۔ بھونرا۔ بیتے ہوئے دن۔ پیا۔ بالم وغیرہ۔ ٹیپ کے بند دلکش ہیں۔ لیکن عمومیت ہے۔ بیکار تواتر و تکرار ہے۔

حفیظ۔ بہزاد کو چھوڑ کر اس زمانہ کے شاعروں میں زیادہ تر شباب، حسن۔ تمناؤں کی نغمہ سرائی ملتی ہے۔ رجائیت بھی ہے اور شگفتگی بھی اور سب سے پہلے حفیظ جالندھری پر نظر اٹھتی ہے۔ اور اسی سلسلہ میں اختر شیرانی اور ساغر نظامی کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان کو ہم پہلی جنگ عظیم اول اور دوسری جنگ کے درمیان کے زمانہ کا شاعر قرار دیں گے۔ ان شعرا کی ایک بڑی خصوصیت ہندی بحروں کو اردو میں رواج دینا اور مقبول عوام بنانا ہے، لیکن زبان اور اسلوب کے اعتبار سے یہ تمام تر اقبال کے پیرو ہیں۔ زبان جہاں سادہ استعمال کی ہے بلا کی سادگی ہے، یہاں تک کہ اس پر بھاشا کا شبہ ہونے لگتا ہے اور بعض اوقات تراکیب فارسی کا استعمال اور تشبیہات اور استعارات کی ندرت اس کے عام فہم ہونے میں حارج ہوتی ہے۔

پطرس بھی نغمہ زار کے دیباچہ میں حفیظ کی ساحری سے مسحور ہو کر جہاں ان کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کو کانپ کر بیدار ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔ جہاں ان کی لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرتی نظر آتی ہے۔ جہاں ان کے دل کی ہوک، اونچے سروں کی الاپ بنکر ان کا کلیجہ مسل دیتی ہے۔ وہاں وہ یہ بھی کہنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ حفیظ کی نظر ہندوستان کی دلہن پر ہے اور وہ اس جھلک پر فدا ہے جو باریک آنچل میں سے دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ابھی وہ ترک شیرازی کی غلامی سے بالکل آزاد نہیں ہوا اور اس کو کنکھیوں سے کبھی کبھی دیکھ لیتا ہے، یہ نظر بازی حفیظ۔ افسر۔ اختر۔ اور ساغر سبھی کے یہاں نظر آتی ہے۔ لیکن باوجود اس نظر بازی کے جو سبک سیری[1] جو فرحت افزائی نغمہ زار کے الفاظ۔ معانی اور بحور میں ملتی ہے وہ کہیں اور نہیں ملتی۔ نغمہ زار حفیظ کا شباب ہے اور اس میں شباب کی جملہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں، نغمہ زار کو ڈاکٹر تاثیر نے نغمۂ شباب بھی کہا ہے کیونکہ حفیظ کے کلام کی خصوصیت شباب اور نغمہ دونوں ہیں۔ خاص کر ان کی "ابھی تو میں جواں ہوں" میں جام شباب چھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ شباب کا یہ سیال اور متحرک جذبہ مناظر قدرت کو بھی متحرک کر دیتا ہے۔ ان کی پہلی نظم 'جلوۂ سحر' ہے کوئی چودہ بند ہیں۔ ہر بند اپنی اپنی جگہ پر ایک منفرد جذبہ ہے اور ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بند دوسرے بند سے پیوست ہوتا چلا جاتا ہے اور ان بندوں میں آزاد یا اسمٰعیل کی سی محض اجزا شماری نہیں اور حسن بصارت کے استعمال سے بڑھکر انھوں نے حواس خمسہ کا بھی استعمال کیا ہے۔ ترنم بھی ہے اور جادو بیانی بھی لیکن سب بند ملکہ ذہن پر کوئی آخری نقش نہیں بناتے۔ ہر بند اپنی جگہ ایک نقش ہے لیکن اگلا بند پچھلے بند کو مٹاتا چلا جاتا ہے اور آخر خود بھی مٹ جاتا ہے۔ گیت کی لے اور الفاظ کے اختصار تلفظ کے باعث پڑھنے والا انھیں جلدی جلدی پڑھتا جاتا ہے، 'فرصت کی تلاش' اپنے اختصار کے باعث اچھا گیت ہے اور ایک قلبی کیفیت کی عکاسی ہے، لیکن 'عکس مشجر' 'زیبائش دریا'، 'وقف روانی'، 'افکار معیشت'۔ 'کسب ہنر'۔ 'دامانِ سخن'۔ 'بخت واژون' اسی ترک شیرازی سے محبت کی غمازی کر رہے ہیں، جس کا ذکر ابھی آچکا ہے۔ 'چاند کی سیر' میں ترک شیرازی کی محبت کا مکمل نمونہ ملے گا۔ اس میں الفاظ و بحر کا ترنم اور موسیقی ایک خاص جاذبیت رکھتی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اس میں قاآنی کے مشہور بہاریہ قصیدہ :-

نسیم خلدمی وزد مگر ز جوئبار ما
کہ بوئے مشک می دہد ہوائے مرغزار ما

کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

---

[1] دیباچہ نغمہ زار ڈاکٹر ایم۔ ڈی تاثیر صفحہ ۸

عطر بیز لالہ زار نغمہ ریز جوئبار
حشر خیز آبشار
کیف موج بے قرار چاندنی میں کوہسار
تھا بہار در بہار
میں یہ شان کردگار دیکھتا چلا گیا،
پاکباز نازنیں، وقف آہ آتشیں،
مرگ و یاس در کمیں
ایک جوان خود پرست بادۂ خودی سے مست
شوخ اور دراز دست
میں یہ سب بلند و پست دیکھتا چلا گیا،

فارسی میں یہی الفاظ سلیس سادہ اور موثر ہو جاتے لیکن اُردو میں گورکھ دھندا بن جاتے ہیں۔ ذہنی تعیش کی لہریں پیدا ہوتی ہیں دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ آل احمد سرور صاحب نے جو جملہ جوش کے لئے استعمال کیا ہے وہ حفیظ پر بھی صادق آتا ہے ۔ قآنی کی طویل جزئیات میں پھر بھی یکرنگی ہے لیکن حفیظ نے 'چاند کی سیر' معلوم ہوتا ہے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر لکھی ہے۔ آبشار، کوہسار، ہشتر دشت، چمن، کنار آب، محفل شراب، پاکباز نازنیں، جوان خود پرست۔ بلندیاں پستیاں، کلفت سفر، بادشاہ کا فرار اور گدا کی قبر، فخر کا اثر، آلِ مال و زر سب دیکھتے چلے جاتے ہیں منظر نگاری میں برسات اور تاروں بھری رات، بسنتی گیت سب میں موسیقیت تو ہے لیکن جزئیات کی گوناگونی اور طوالت نے ایک سقم پیدا کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ کرشن کنہیا، کی نظم میں کنہیا ایک علامت اور اشارے کے طور پر استعمال ہونے کے بجائے تاریخ ہندوستان کا ایک فرد بنکر رہ گیا ہے۔ ایک بند میں یہ "نقش خیالی" ہے۔ 'پیکر تنویر' ہے دوسرے میں 'بانسری والا گوکل کا گوالہ'،

بُت خانہ کے اندر ——— خود حسن کا بُت گر ——— بُت بن گیا آ کر

پھر گوپیوں کے ساتھ - ہاتھوں میں دئے ہاتھ، برجناتھ رقصاں ہے جو عشق مغرور بھی ہے اور حسن مجبور بھی پھر یہ 'سحر مسحور' گیتا کا اپدیش سناتا ہے پھر مہابھارت میں شمشیر بن کر عدو سوز ہو جاتا ہے۔ گیت کے معاملہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ بحور اور عروض میں نہایت حسین اختراعات کیں۔ موسیقیت اور ترنم کو شاعری کا ایک جزو لاینفک بنایا، نغمہ زار کے گیت طویل ہیں لیکن الگ الگ چند بند ان گیتوں میں لاجواب ہیں۔ مثلاً 'برسات میں' جھولے والا اور

لہ چاند کی سیر۔ نغمہ زار صفحہ ۴۸

اور تاروں بھری رات میں خاموش پانی والا بند یا 'بسنتی ترانے' میں لڑکوں کی ڈور اور پتنگ کی جنگ اور پھولوں کے زرد گہنے والا بند

آموں[1] کے نیچے
ڈالے ہیں جھولے
مہ پیکروں نے سیمیں تنوں نے
برق افگنوں نے
گیت انکے پیارے میٹھے رسیلے،
ہلکی صدائیں سادہ ادائیں
گل پیرہن ہیں غنچہ دہن ہیں
خود مسکرانا خود منہ چڑانا
پھر جھیپ جانا
الٹھرپنے سے
آموں کے نیچے ڈالے ہیں جھولے
دلکش[2] نظارے
شب زادسارے
ندی کی تہ میں رقصاں ہیں تارے
گاتی ہیں لہریں گیت ایسے پیارے
چپ دم بخود ہیں دونوں کنارے
ہر سمت سزا
سرمست صہبا
لیٹا ہے کیا
پاؤں پسارے
ہے سرسراہٹ خاموشیوں میں
یعنی ہوا ہے سرگوشیوں میں
خاموش پانی
محو روانی !
چلتا مچلتا پہلو بدلتا،
بہتا بہاتا کچھ گنگناتا !
بل ہے جبیں پر
تاروں کا دفتر
سینے کے اندر
چاتر گیانی ! خاموش پانی !

ان بندوں میں علاوہ ترنم اور سادگی کے ایک مخصوص نقش اپنے مقامی رنگ میں نظر آتا ہے، ان کے دوسرے مجموعۂ کلام 'سوز و ساز' میں زیادہ پختہ کاری نظر آتی ہے اب وہ سمجھ گئے ہیں کہ گیت کی زبان اور غزل کی زبان میں فرق ہے گیت میں اختصار پیدا ہو گیا ہے اور ریزہ خیالی کے بجائے منفرد جذبہ نظر آتا ہے 'نغمہ زار' کے گیتوں میں[3] اُردو شاعری کی قدیم خصوصیات موجود ہیں اور ایسا ہونا ضروری تھا کیونکہ حفیظ کو اپنی عمارت انھیں بنیادوں پر کھڑی کرنی تھی، لیکن 'سوز و ساز' کے گیتوں میں[4] فضولیات کو ترک کر کے عام طور پر صرف انھیں خصوصیات کو لیا ہے جو ہر لحاظ سے پسندیدہ یا کم از کم قابلِ برداشت تھیں، اُردو شاعری میں حفیظ کو گیتوں کا موجد کہنا تو 'سوز و ساز' کے دیباچہ نویس کی زیادتی ہے، لیکن

---

[1] برسات۔ نغمۂ زار صفحہ ۶۳۔ [2] تاروں بھری رات بند (۴) صفحہ ۷۳۔ [3] دیباچہ سوز و ساز۔ صفحہ ۱۹-۲۰

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو شاعری کے گیتوں میں ایک نئی لذت اور ایک نیا رس پیدا کر دینے کا سہرا ان کے سر ہے۔ سوز و ساز کے گیتوں میں پہلے سے زیادہ سادگی۔ لطافت اور دلآویزی ملتی ہے۔ بحور و اوزان میں اجتہاد کر کے انھوں نے گیتوں کی تصنیف کے امکانات میں اضافہ اور میدان میں وسعت پیدا کر دی ہے۔ گیتوں میں بحر و وزن کے انتخاب میں بھی حفیظ نے اپنی بالغ نظری اور ذوقِ سلیم کا ثبوت دیا ہے۔ 'ابھی تو میں جوان ہوں' میں مستی اور جوش 'جلوہ سحر' میں بیداری اور غنودگی کی کیفیات 'برسات' میں ارمان بھری ہوک اُٹھنے کی کیفیات طاری ہو جاتی ہیں۔ 'پریم کے گیت' میں پریم کی صلاحیتوں کا نمو حاصل ہوتا ہے۔ 'شہسوارِ کربلا' میں دلیری اور شجاعت کی چھریری آجاتی ہے غرض موضوع کلام۔ نفسِ مضمون۔ طرزِ ادا۔ وزن کی باہمی مناسبت کو دیکھتے ہوئے حفیظ کا یہ دعویٰ تعلّی نہیں اصلیت ہو جاتا ہے کہ:-

کیا پابند نے نالے کو میں نے — یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

'سوز و ساز' کے گیتوں کا عنوان اسی شعر سے قایم کیا گیا ہے مثلاً 'کرشن بنسری' میں مہا بھارت کا کرشن نہیں بلکہ بنسری والا کرشن الاپتا ہوا سنائی دیتا ہے۔

بنسری[1] بجائے جا
کاہن مُرلی والے نند کے لال،
بنسری بجائے جا
بنسری بجائے جا
پریت میں بسی ہوئی اداؤں سے
گیت میں بسی ہوئی صداؤں سے
برج باسیوں کے جھونپڑے بسائے جا
سنائے جا سنائے جا
کاہن مُرلی والے نند کے لال
بنسری بجائے جا

'دل ہے پرائے بس میں' داخلیت بھی ہے' انفرادیت بھی۔ سادگی زبان بھی ہے اور ترنم بھی اور بے ساختگی بھی۔

بیت[2] گیا دن رات بھی آئی، — تاروں نے محفل بھی سجائی
اُس نے مگر صورت نہ دکھائی

---

[1] سوز و ساز۔ صفحہ ۲۰ — [2] سوز و ساز۔ حفیظ۔ صفحہ ۴۰

وہم کئی پالے ہیں میں نے تارے گن ڈالے ہیں میں نے
وعدے کا تو کس کو یقیں ہے آنکھ میں لیکن نیند نہیں ہے
نیند نے کھالیں قسمیں،
دل ہے پرائے بس میں

پریت کے گیت میں وطنی جذبہ کام کر رہا ہے۔ لیکن ترنم، زبان، علامات کے اعتبار سے 'نغمہ زار' کے گیتوں سے بہت آگے ہے۔

اپنے من میں پریت
بسالے

اپنے من میں پریت

من مندر میں پریت بسالے او مورکھ او بھولے بھالے
دل کی دنیا کرے روشن اپنے گھر میں جوت جگالے
پریت ہے تیری ریت پرانی بھول گیا او بھارت والے
بھول گیا او بھارت والے

پریت ہے تیری ریت
بسالے

اپنے من میں پریت

فرشتہ کا گیت، فریب عنوان ہے۔ اس گیت میں صرف اتنی قدوسیت ہے جتنی ہر پاک جذبہ میں ہو سکتی ہے ورنہ گیت کی ارضیت فرشتوں کے گیت اور ان کے پیغامات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن کلیم الدین صاحب کا اس میں اقبال کے 'فرشتے کا فرمان' سے مقابلہ کر کے عیب نکالنا مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے۔ دونوں نظمیں اپنی نوعیت، موضوع اور نفس مضمون کے اعتبار سے بالکل جدا چیزیں ہیں۔ فرشتہ کا لفظ آجانے سے ان میں کوئی مماثلت پیدا نہیں ہوتی۔ "اندھی جوانی" کا پہلا بند معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے ایک کامیاب گیت کا نمونہ ہے۔

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں کالی کالی — خوب برسنے والی — متوالی — پُرشور — گھٹائیں — چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور۔

لے سوز و ساز - صفحہ ۸۱ — لے سوز و ساز - حفیظ - صفحہ ۸۹

کلیم الدین صاحب ان تنقید نگاروں میں سے ہیں جن کی خوردہ بینی صرف معائب کی تلاش میں رہتی ہے ان کو بھی حفیظ کے گیت پسند ہیں وہ تسلیم کرتے ہیں کہ حفیظ کے گیتوں میں شعریت ہے قوت اختراع اور جدت طرازی موجود ہے شعر کی موسیقی سے متاثر ہیں اور اپنے معاصرین پر اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ ان کے گیتوں میں تنوع۔ شیرینی، نرمی اور ملائمت ہے، طوالت کے نقص کی طرف ان کا اشارہ صحیح ہے، لیکن ان تمام تعریفوں پر یہ کہکر یک قلم پانی پھیر دیتے ہیں کہ ان کے جذبات و خیالات کی سطح نیچی ہے اس سبب سے ان سے تہذیب یافتہ دماغ کو سرور حاصل نہیں ہوتا، لیکن جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا ہے، خیالات کی سطح کا نیچا ہونا۔ تہذیب یافتہ دماغ اور سرور اضافی چیزیں ہیں جسے وہ سطح کی بلندی سمجھتے ہیں عوام کے لئے وہ معمہ ہے۔ ان کا تہذیب یافتہ دل اور دماغ عوام کے لئے تعیش ذہنی ہے اور ان کا سرور عوام کے لئے ایک لایعنی چیز ہو سکتا ہے۔ اس دور جدید میں شاعری کا ایک نیا دبستاں بھی کھل چکا ہے جہاں سب پرانی اقدار منقلب ہو چکی ہیں۔ (باقی)

بسم اللہ بیگم

"نگار" کا آئندہ سالنامہ

ایک مستقل کتاب ہوگی

سیکڑوں صفحات کی جس میں اسوقت کی تمام اہم مسلم حکومتوں کے سیاسی و اقتصادی مسایل پر روشنی ڈالی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ عہد حاضر کی مسلم آبادی جو ایران سے لیکر مصر و عراق تک پھیلی ہوئی ہے کس دور سے گزر رہی ہے اور کس قدر بے چینی کے ساتھ۔

ایک مستقبل کی تلاش

میں سرداں ہے

نگار کا یہ سالنامہ، تمام پچھلے سالناموں سے بالکل مختلف نوعیت کا ہوگا اور اس میں بجائے شعر و ادب کے زندگی کے ان مسایل پر گفتگو کی جائے گی جن کے سمجھنے پر قوموں کی موت و زندگی کا انحصار ہے۔

یہ سالنامہ گویا وقت کی پکار ہے

اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس پکار کو سنے اور اس پر غور کرے۔ امید ہے کہ آپ اپنے احباب پر اس سالنامہ کی اہمیت واضح کر کے نگار کی سالانہ خریداری کی طرف ان کو متوجہ کریں گے اور خود بھی سلسلۂ خریداری کو جاری رکھیں گے۔ اس سالنامہ کی قیمت سالانہ خریداروں سے زاید نہیں لی جائے گی، لیکن جو حضرات صرف سالنامہ لینا چاہیں گے ان کو فی کاپی تین روپیہ چھ آنے معہ محصول ڈاک ادا کرنا ہوگا۔ اس سالنامہ کے ساتھ آپ کو مجموعۂ استفسار و جواب کی تیسری جلد بھی نصف قیمت (ڈیڑھ روپیہ) میں ملسکتی ہے لیکن یہ آپ کی خوشی پر منحصر ہے۔ کوئی مجبوری نہیں ہے۔ مجموعہ استفسار کی یہ جلد ۵۰۰ صفحات کو محیط ہے، جس میں سیکڑوں مذہبی علمی، سیاسی اور ادبی مسایل پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ رعایت صرف سالانہ خریداروں کے لئے ہے خواہ ان کی خریداری کسی وقت سے شروع ہو۔

انیس کی مرثیہ نگاری

اور

"فاروقی صاحب کی ستم ظریفی"

(بہ سلسلۂ ماسبق)

فاروقی صاحب کے مضمون کا جتنا حصہ اب تک نظر سے گزرا ہفوات کا پشتارہ ہے اور بس۔ مئی ۱۹۴۹ء کے ضمیمہ کے آخر میں یہ فرما کر کہ میر انیس کسی طرح مفکر نہ تھے اور اس لئے ان کے مرثیے اُن لوگوں کے لئے کسی خاص دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتے جو شاعری میں غور و فکر کے عنصر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ ان کی رباعیوں اور سلاموں میں ایک آدھ شعر ایسے ضرور آ گئے ہیں جن میں کچھ فکر کا پہلو پایا جاتا ہے مثلاً :۔

نمود و بود بشر کیا محیط عالم میں ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا
تڑپ تھی برق کی یہ یا کہ تھی شرر کی لپک ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

اگر غور و فکر کے عنصر سے ہٹ کر کوئی پوچھے کہ آپ جس مبالغہ کی اس قدر مذمت کر رہے تھے کیا ان اشعار میں نہیں ہے تو فاروقی صاحب بغلیں جھانکنے لگیں۔ رہا غور و فکر کے عنصر کا سوال، میرا دعویٰ ہے کہ اس کے لئے ہر مرثیے میں سامان وافر موجود ہے لیکن اُس کے لئے جو آرٹ کا مطالعہ آرٹ کے نقطۂ نظر سے کرتا ہے، جو شاعر کے بیان کردہ واقعات زندگی و مناظر قدرت کو اُسی نظر سے دیکھتا اور ترتیب دیتا ہے جس طرح آرٹسٹ نے دیکھا اور ترتیب دیا اور اُسی فراغدلی کے بعد کھرا کھوٹا پرکھتا اور حکم لگاتا ہے۔ یہ نعمت یہ دماغی و روحانی اہتزاز اُس شخص کے نصیب کا نہیں جو آرٹسٹ کی پیشکش میں سائنس یا فلسفے کے مسایل ہی نہیں ڈھونڈھتا بلکہ اُن کا حل بھی تلاش کرتا ہے، جس کے ذوق کی جولانگاہ وجدان کی قلمرو نہیں بلکہ چیر پھاڑ کی میز ہے، جس کو اتنا وقوف نہیں کہ "انسانی عظمت کی معراج حقیقت کا افسانہ بن جانا ہے"۔

جون ۱۹۴۹ء کے ضمیمۂ نگار سے مترشح ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب کو مراثیِ انیس میں جو خوبی نظر آئی یہ ہے کہ انیس اسپنسر (Spenser) کی طرح مصور شاعر تھے مگر اُن کی ایسی شاعری میں بھی یہ عیب ہے کہ مبالغہ آمیز ہے اس تحسین ناشناس سے انیس کی منزلت نہیں بڑھتی۔ اسی قسط کی تمہید میں اُنھوں نے بڑے شد و مد سے فرمایا ہے کہ وہ "مرثیوں کے اُن خصوصیات کو بیان کریں گے جن کو لوگ اب تک نظر انداز کرتے رہے حالانکہ ان کی اہمیت اس قدر ہے

کہ اگر انیس کے مراثی کو کسی طرح دائمی زندگی حاصل ہو سکتی ہے تو ان خصوصیات کی بنا پر"۔ خدا کی شان کہ فاروقی صاحب سا ناآشنائے راہ سخن زندۂ جاوید انیس کو دائمی زندگی بخشنے کا دعویٰ کرے، اس سے زیادہ انیس کی توہین ہو ہی نہیں سکتی۔ جو شخص فوٹو گرافی کو مصور کے موقلم کی رنگ آمیزی پر ترجیح دے وہ اور انیس کے منھ آئے! تفو بر تو اے چرخ گردان تفو!

فاروقی صاحب کی عبارت یہ ہے :-

"میر انیس کی تصویریں حقیقی فوٹو گراف نہیں بلکہ آرٹ کی تصویریں ہو کر رہ گئی ہیں" (ص ۵۰)

ایپک شاعری، لیریکل شاعری وغیرہ کا ذکر کہیں ہو چکا ہے۔ اب فاروقی صاحب کی اُپج ملاحظہ ہو:-

"جس کو فلسفۂ اخلاق سے تعلق ہوتا ہے وہ ایپک شاعر ہوتا ہے، جس کو اپنے خارجی جذبات وغیرہ سے تعلق ہوتا ہے وہ لیرک شاعر ہوتا ہے"۔ (ص ۵۱)

ایپک شاعری فلسفۂ اخلاق ہو گئی، شاعر کے اپنے جذبات خارجی ہو گئے! اور مزعومات عالیہ سنئے :-

"اسی طرح فن کے لحاظ سے بعض شاعروں کو بت گری سے مناسبت ہوتی ہے، بعض کو مصوری سے بعض کو موسیقی سے"۔

عبارت کی مہملیت سے قطع نظر شاعر بیک وقت مصور بھی ہوتا ہے، بت تراش بھی ہوتا ہے، مغنی بھی ہوتا ہے، فاروقی صاحب ہر شاعر کو الگ الگ خانوں میں بند کرتے ہیں۔ تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں۔ ادب اور شاعری پر اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ بلا کسی استثنا کے فاروقی صاحب کے قول کی تردید کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ سے مستفید ہونا بھی اُن کی قسمت میں نہیں۔

شاعری میں مصوری کا وہی مفہوم ہے جس کو ارسطو نے نقل (Mimesis or Imitation) سے اور جدید نے نقشہ کھینچنے یا تصویر اُتارنے (Representation) سے تعبیر کیا ہے اور جسے ہم لوگ محاکات کہتے ہیں۔ یہ نقل ہو بہو نہیں ہوتی بلکہ ایسا عمل ہے جس کو زندگی کی از سر نو تخیلی تعمیر (Imaginative recreation of life) کہہ سکتے ہیں۔ ان حقایق کی روشنی میں فاروقی صاحب کے مندرجۂ بالا اقوال کس قدر ناقص طفلانہ اور مضحکہ خیز ہو جاتے ہیں۔ اگر محاکات اور تخیل کے باہمی ربط، متحدہ عمل اور اثر اندازی پر غور کیا جائے تو فاروقی صاحب کی ہرزہ سرائی اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ شاعر کی طیار کردہ تصویر میں اگر تخیل نے رنگ نہیں بھرا ہے اگر اُس نقطۂ نظر یا جذبہ کا اظہار نہیں ہے جس کے ماتحت شاعر نے فکر یا مشاہدہ و مطالعہ کیا ہے تو ایسی تصویر میں جاذبیت یا رعنائی نہیں ہو سکتی، وہ شاعری یا صناعی نہ ہوئی بلکہ نری کھری نقالی ہے۔

شاعری میں مصوری کا اگر یہی مفہوم ہے جو میں نے عرض کیا تو اس کی روشنی میں مراثی انیس کے بیشتر مقامات تخیل اور محاکات کے لطیف امتزاج کے نادر مرقعے ہیں۔ ان میں واقعات اور جذبات مصور ہو گئے ہیں۔ ان میں زندگی کی لہر ہے

اسٹنگ ہے، دھڑکن ہے، لیکن یہ نکات و لطایف غیر شاعرانہ اور مادہ پرست دماغ جو اپنی بدقسمتی سے انتقاد کی طرف جھک پڑا ہے نہ سمجھا ہے اور نہ سمجھے گا کیونکہ۔

"عمدہ شاعری میں ایک نغمۂ تحت مفہوم (Under Song of Sense) ہوتا ہے جس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کی فطرت میں شعریت ہے یا جو شاعری کے رموز کا ماہر اور ادا شناس ہے"۔

غالباً گیٹے کا قول ہے کہ:-

"شاعر اور بت تراش ہمارے سامنے اشیا کی سنوری ہوئی نقل پیش کرتے ہیں اور اس آرائش میں ایسی صناعت سے کام لیتے ہیں کہ ہم اُسی نقل کو اصل سمجھنے لگتے ہیں، اُن کی فریب کاری ہے تو بس اس قدر اور یہی اُن کے آرٹ کا کمال بھی ہے"۔

ایک دوسرا نقاد اسی مطلب کو یوں ادا کرتا ہے:-

"شاعر خواب دیکھتا ہے مگر ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدلل بحث کر رہا ہے"۔

کلام انیس کو ہر معنوی خوبی و رفعت سے محروم کر کے فاروقی صاحب اُس کے ظاہری محاسن کی تعریف کرتے ہیں۔ طرز ادا نیچرل ہے، بیانات نیچرل ہیں اور بیانات کے سلسلہ میں جتنے رنگ اختیار کئے گئے ہیں وہ سب نیچرل ہیں۔ کلام کی نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ سہل ہے اور اکثر سہل ممتنع ہے۔ کلام میں مادی لطافت ہے، رنگیں بیانی۔ شگفتگی ہے اور زندگی میں ڈوبا ہوا ہے۔ شیرینی ہے۔ نفاست و پاکیزگی و متانت ہے۔ خوشگوار مبالغہ ہے۔ نسائیت ہے یعنی لہجے میں نرمی اور نزاکت ہے۔ زور و روانی ہے۔

فاروقی صاحب نہیں مانتے تو نہ مانیں مگر مواد کے لحاظ سے بھی ایپک شاعری کے تمام خصوصیات مراثی انیس میں موجود ہیں۔ مجھے جو کچھ اس بارے میں عرض کرنا تھا عرض کر چکا لیکن ستمبر ۴۹ء کے ضمیمۂ نگار میں انیس کی زبان کی تعریف کرنے کے بعد فاروقی صاحب نے چند تازہ مباحث چھیڑ دئے۔ فرماتے ہیں:-

"مگر ہے یہ ایک خاص قسم کی زبان جو ایک خاص مقام اور طبقہ سے مخصوص ہے اور باوجود تمام خوبیوں کے ایک محدود قسم کی زبان ہے اس لئے یہ زبان ایپک شاعری کی زبان نہیں ہو سکتی کیونکہ ایپک ہمیشہ عالم و فلسفی کی تصنیف ہوتی ہے۔ ملٹن نے برسوں علم و فضل حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ ایپک شاعر ہو سکے"۔

اول تو یہ ادعا ہی غلط ہے کہ ایپک ہمیشہ عالم و فلسفی کی تصنیف ہوتی ہے۔ کیا ایپک شاعری کا باوا آدم ہومر عالم و فاضل تھا ایک کثیر تعداد یورپ کے قدیم منظوم قصص کے مصنفین کی ایسی ہے جنھوں نے کسی اسکول یا مدرسے کی صورت بھی نہ دیکھی تھی لیکن اُن کی نظمیں مقبول عام تھیں ایسی ہی تصانیف میں "بٹوالف" اور "کالیویلا" ہیں۔ شیکسپیر کی علمیت بھی مابہ النزاع ہے اس جگہ افلاطون کی ایک عبارت کا ترجمہ پیش کرنا بیجا نہ ہوگا:-

"تمام اچھے شاعر خواہ اُن کی جولانگاہ فکر رزمیہ (Epic) شاعری خواہ غنائیہ (Lyric) شاعری ہو اپنی خوبصورت نظمیں آرٹ کی مدد سے مرتب نہیں کرتے بلکہ اُنھیں الہام ہوتا ہے، وجد طاری ہوتا ہے اور جس طرح کوری بنٹیا کے دھمالی (Corybantian wellers) ہنگام رقص اپنے ہوش میں نہیں رہتے اسی طرح غنائی شاعر ہنگام تخلیق نظم آپے سے باہر ہوتے ہیں ..... شاعر ایک لطیف ہستی شہپر رکھنے والی مقدس مخلوق ہے۔ وہ کچھ ایجاد نہیں کرتا جب تک اُسے الہام نہ ہو اور بیخود نہ ہو جائے۔ جب تک یہ حالت نہ ہو وہ مجبور و معطل ہے اور اپنے آفریدہ طلسمات پیش نہیں کر سکتا۔"

شیکسپیر نے اسی کیفیت کو (Poet's Frenzy) شاعر کے دماغ کی کھون سے تعبیر کیا ہے۔ میر انیس کے متعلق مشہور ہے کہ جب مرثیہ کہنے کا "دورہ" پڑتا تھا تو چادر اوڑھ کر لیٹ جاتے تھے، وہ اشعار موزوں کرتے جاتے اور اُن کا جو بھائی یا دوست موجود ہوتا وہ لکھتا جاتا۔ یہ سچ ہے کہ عظیم شاعر کے لئے فلسفی ہونا لازم ہے مگر فاروقی صاحب کے علاوہ نہ تو میں نے کہیں پڑھا نہ کسی کو کہتے سنا کہ اُس کا فلسفہ کسی درس یا نظام کا مرہون منت ہوتا ہے۔ جن حقایق تک فلسفی کی رسائی غور و فکر و دماغ سوزی کے بعد ہوتی ہے شاعر کو القا ہوتا ہے۔ دوسروں کو جو علم تجربہ یا مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے وہ محض اپنی تخئیل سے اخذ کر لیتا ہے۔ کسی نے بڑے پتے کی بات بلیغ انداز میں کہی کہ:۔

A poet imagines Experience

شاعر کی تخئیل ہی اُس کا فلسفہ، منطق، تجربہ، تجزیہ سب کچھ ہے۔ کوئی فاروقی صاحب سے پوچھے کہ ملٹن کی جگہ شاعروں کی صف میں ہے یا فلسفیوں کی جماعت میں۔ کیا وہ کسی نظام فلسفہ کا موجد ہے؟ اگر انیس کے خیالات اُن کی زبان کے سانچے میں ڈھل سکے، زبان و بیان شیر و شکر ہو گئے تو یہ کہنا کہ اُن کی زبان ایپک شاعری کی زبان نہیں ہو سکتی ایک لچر بات ہے۔

پھر فاروقی صاحب یوں لب کشا ہوتے ہیں:۔

"یہ زبان (انیس کی زبان) ڈرامہ کی زبان ہونے کے لئے بھی بہت محدود ہے۔ ڈرامہ میں ہر قسم کے اشخاص آتے ہیں اور ڈرامہ کی خوبی یہ ہے کہ ہر شخص اپنے طبقہ کی زبان بولے۔ شیکسپیر کے یہاں بادشاہوں سے لیکر فقیروں اور اُٹھائی گیروں تک ہر طبقہ کے مختلف افراد آتے ہیں اور ہر ایک اپنے طبقہ کی زبان بولتا ہے۔"

ہائے وہ شخص جس کی عقل پر پتھر پڑے ہوں اور جو ڈرامہ کی زبان اور ڈرامائی زبان میں فرق نہ کر سکے! ایپک ڈرامہ نہیں البتہ اس میں ڈرامائی شان ہونا چاہئے۔ یہی ارسطو کا قول ہے جو بیشتر نقل ہو چکا ہے اور خود فاروقی صاحب تسلیم کر چکے ہیں۔

فاروقی صاحب انیس کے مراثی میں ربط و تسلسل بھی نہیں پاتے۔ مثال میں مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" لے کر فرماتے ہیں کہ:۔

"دیکھئے اس مرثیہ میں مکان و زماں کا لحاظ کتنا کیا گیا ہے۔ مرثیہ کی ابتدا صبح کے منظر سے ہوتی ہے۔ پھول کھلے ہوئے

خوش الحان چڑیاں چہچہا رہی ہیں یعنی یہ ایسا مقام ہے جہاں بہار پورے عروج پر نظر آتی ہے پھر نظر آتی ہے پھر کچھ آگے بڑھکر آفتاب اور تاب و تپ کا ذکر ہوتا ہے اور گرمی کی یہ شدت ہے کہ دن کا رنگ رات سے زیادہ سیاہ نظر آتا ہے اور اگر پائے نگاہ بھی کہیں ٹھہر جائے تو اُس میں لاکھ آبلے پڑ جائیں۔ اب غور کیجئے وہ کون مقام ہو سکتا ہے جہاں بہار و خزاں دونوں کمال شدت کے ساتھ ایک ہی وقت میں موجود ہوں۔"

فاروقی صاحب نے متضاد مناظر کے بیان کا درمیانی وقفہ کچھ آگے کھسکا دیا ہے حالانکہ پہلا منظر انیس نے نماز صبح کے وقتِ فضیلت یعنی سپیدۂ سحری نمودار ہونے سے بھی پہلے دکھایا ہے کیونکہ اس کے بعد بند نمبر ۳۲ اس مصرع سے شروع ہوتا ہے:۔ "ناگاہ چرخ پر خطِ ابیض ہوا عیاں" علاوہ بریں انیس نے صبح سویرے کی خنکی اور دن چڑھے کی گرمی کا تقابل کیا ہے نہ کہ بہار و خزاں کا۔ اُس نے منظر کشی میں بہار و خزاں کا نام تک نہیں لیا، یہ الفاظ ریاض رسول کے لئے استعمال کئے:۔

کانٹوں میں اک طرف تھے ریاضِ نبی کے پھول — خوشبو سے جن کی خلد تھا جنگل کا عرض و طول
دنیا کی زیب، زینت کاشانۂ بتول — وہ باغ تھا لگا گئے تھے خود جسے رسول

ماہِ عزا کے عشرۂ اول میں لُٹ گیا
وہ باغیوں کے ہاتھ سے جنگل میں لُٹ گیا

اللہ رے خزاں کے دن اُس باغ کی بہار — پھولے سماتے تھے نہ محمد کے گلعذار
دولھا بنے ہوئے تھے اجل تھی گلے کا ہار — جاگے وہ ساری رات کے وہ نیند کا خمار

راہیں تمام جسم کی خوشبو سے بس گئیں،
جب مسکرائے پھولوں کی کلیاں بکس گئیں

انیس نے گرمی کا سماں بند نمبر ۱۱ سے اس طرح دکھانا شروع کیا ہے:۔

"گرمی کا روزِ جنگ کی کیونکر کروں بیاں"

پورے سو بندوں کے درمیانی فاصلے کو فاروقی صاحب اپنا نقشہ جمانے کے لئے کچھ آگے سے تعبیر کرتے ہیں! یہ ایک عام حقیقت ہے کہ سخت سے سخت گرمی کے موسم میں علی الصباح نسبتاً خنکی ہوتی ہے۔ مزید برآں فاروقی صاحب نہیں جانتے تو نہ جانیں ایک معمولی شخص بھی جانتا ہے کہ ریگستان میں دن اور رات کے درجۂ حرارت میں بڑا فرق ہوتا ہے وہ اس وجہ سے کہ تیلی زمین تموز آفتاب کو بڑی تیزی سے اور بڑی مقدار میں جذب کر لیتی ہے، اسی طرح دوسری قسم کی زمینوں سے ہنگام شب پچھلے پہر تک زیادہ خنک بھی ہو جاتی ہے۔ گرمیوں میں عراق کے ریگستان میں دن چڑھے پارے کا ایکسو بیس ۱۲۰ ڈگری ہونا معمولی بات ہے۔

فاروقی صاحب نے اپنی خوش فہمی و خوش مذاقی کی ایک اور مثال بھی پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"اس مرثیہ "جب کربلا میں داخلۂ شاہ دیں ہوا" کو لیجئے۔ یہاں شروع میں وہ واقعہ بیان کیا گیا ہے جب حضرت عباس کو فوج شام نے نہر پر خیمے نصب کرنے سے روکا اور حضرت کو جلال آگیا۔ یہ واقعہ عاشورہ سے تین دن پہلے کا ہے۔ لیکن اس مرثیہ میں حضرت عباس کا میدان میں جانا بھی بیان ہوا ہے جو تین دن بعد کا واقعہ ہے بات یہ ہے کہ اتحاد زمان و مکان کا لحاظ رکھنے کی مرثیہ نگاروں کو ضرورت نہ تھی اور نہ اس طرف دھیان۔"

فاروقی صاحب نے پھر غلط بیانی سے کام لیا۔ فوج مخالف کا اصرار تھا کہ خیام اہلبیت حسین کنار نہر نصب نہ ہوں، حضرت عباس بضد تھے کہ یہیں نصب ہوں گے۔ بات بڑھی اور حضرت عباس کو غیظ آگیا اور سرداران فوج شام سے سختی سے گفتگو کی۔ قریب تھا کہ تلوار چل جائے، مگر امام حسین اپنے بپھرے ہوئے شیر کو سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ اس سلسلہ میں حضرت عباس کا میدان میں جانا خود فاروقی صاحب کے خلاق دماغ کی پیداوار ہے اور بس۔ اسی لئے میدان میں جانے کے بعد کا قصہ گومگو رہا۔

اس ضمیمہ میں فاروقی صاحب عذر گناہ بدتر از گناہ کے بھی مرتکب ہوئے ہیں کیونکہ ارشاد ہوا ہے کہ میر انیس کے کلام میں ڈرامہ، ایپک وغیرہ کا فقدان ظاہر کرنے سے اُن کا مقصد میر انیس کی ہتک نہیں بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ جو لوگ یورپ کی شاعری کے مقابلہ میں مرثیوں کو پیش کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو مگر پرائے شگون کے لئے اپنی رسوائی کو کیا کہتے ہیں۔

کہیں پیشتر فاروقی صاحب نے انیس کو اسپنسر سے مشابہ کیا تھا، اس ضمیمہ میں کیٹس کا ہمسر بنا دیا ہے۔ لہذا کیٹس، اسپنسر ہوا اور اسپنسر، کیٹس ہوا۔ انیس دونوں ہوئے مگر خود کچھ نہ ہوئے! خود ہی فرماتے ہیں کہ انیس کو یورپ کے کسی معمولی شاعر کے مقابلہ میں بھی پیش نہیں کیا جا سکتا اور خود ہی پیش کرتے ہیں وہ بھی اسپنسر اور کیٹس کے مقابلہ میں!۔

اسی ضمیمہ میں فاروقی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"ہماری شاعری میں وسعت نقش و اثر کی طرف کبھی توجہ ہی نہ کی گئی۔ یورپ کی شاعری کا فن اُس مصور کا فن ہے جو گزوں لمبی کرچ پر ایک تصویر بنائے، برخلاف اس کے ہماری شاعری کا فن اُس مصور کا فن ہے جو انگوٹھی کے نگینوں یا چاول کے دانوں پر نقش و نگار بنائے۔ میر انیس کے یہاں وہ خصوصیت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی جو یورپ میں یونانی ڈرامہ اور ایپک کے لئے ضروری ہے اور جس کے مطابق ہر بڑے شاعر کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ ایک طویل نظم کامیابی کے ساتھ لکھے۔ اُردو شاعری شعروں اور بندوں کی شاعری ہے اور انگریزی شاعری نظموں کی شاعری ہے (اور اگر میں کہوں کہ انگریزی شاعری لائنوں یا مصرعوں کی شاعری ہے تو کس کا منہ ہے کہ تردید کرے؟ اثر) ۔ دونوں کی راہیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔"

اگر فاروقی صاحب Epic اور Episode کا فرق ذہن میں رکھتے تو شاید ایسی فاحش غلطی سرزد نہ ہوتی۔ ہر مرثیہ ایک Episode ہے جو کربلا یا اُس کے ماقبل یا مابعد کے کسی خاص واقعہ یا واقعات کا مرقع ہے۔ کُل کا ایک جزء ہے۔ کل واقعات بحیثیت مجموعی بمنزلۂ کتاب کے ہیں، مکمل ایپک ہیں یا اگر خاص ترتیب کو دخل دیا جائے تو متعدد ایپک ہیں۔ مختلف مراثی اصل کتاب کے ابواب ہیں۔ لیکن ان اجزا میں ایک امتیازی شان بھی ہے، یعنی فرداً فرداً مختلف اسالیب سے بیان کئے گئے ہیں بالفاظ دیگر مفرد یا مخصوص واقعات پر متعدد مراثی ہیں۔ اس اعتبار سے دُنیا کی رزمیہ شاعری میں یہ رزمیہ شاعری فقید المثال ہے اور اُن پر افضلیت رکھتی ہے۔ فاروقی صاحب گزوں لمبی کرمچ لئے پھرتے ہیں یہ کرمچ میلوں لمبی ہے جس کو چابکدست انیس کے صناع دماغ نے کلک نادر کار کی مدد سے مختلف ایوان کے دلپسند و دیدہ زیب نقش و نگار سے آراستہ کر کے ایسا شاہکار طیار کر دیا ہے جس کے رنگوں کا تال میل، خطوط کی نزاکت و نفاست مناظر کی جلالت و جزالت اپنی مثال آپ ہیں مگر نظر باز کے لئے۔ اس مرقع کے اجزا بجائے خود بھی مکمل ہیں اور سب مل جل کر بھی تناسب آفریں ہیں۔ یہ نقوش انگوٹھی کے نگ یا چاول کے دانے پر کندہ نہیں ہیں بلکہ عروس نو کی زرتار قد آدم نقاب کی طرح تہ در تہ ہیں اور ایک پیکر جمیل کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہیں اگر فاروقی صاحب کی طرح کرمچ کی عامیانہ تشبیہ کا جواب مطلوب ہو تو Survey of India کے محکمہ کا ایسا نقشہ ہیں جو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہے اور جسے حسب ضرورت کھولا یا تہہ کیا جا سکتا ہے۔ پورا کھول دیا تو فاروقی صاحب کی گزوں لمبی کرمچ پر چھا گیا۔

آیئے اب فاروقی صاحب کی طمع سازی کو پروفیسر محی الدین قادری زور کی مہیا کردہ محک پر کسیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

"دنیا کی اور عظیم الشان نظمیں جن کی زبان اور خیالات نے اپنے اپنے ملک و قوم کی ذہنیت اور اخلاق و عادات کی اصلاح کی حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ایلیڈ ۔۲۔ اینیڈ ۔۳۔ مہابھارت ۔۴۔ رامائن ۔۵۔ پیراڈائز لاسٹ ۔۶۔ شیکسپیر کے بعض ڈرامے۔ ۷۔ شاہنامہ۔

گو ان تمام کے مصنفین زندۂ جاوید فلسفی، ممتاز شاعر اور بلند خیال معلم اخلاق ہیں اُن کے دماغوں کی ساخت میں یکسانیت نمایاں ہے اور ان میں زبان پر ایسی قدرت اور اُن کے خیالات میں اس درجہ وسعت نظر آتی ہے کہ انکا کلام انسانی طاقت سے باہر نظر آتا ہے۔ لیکن ان سب شہ کاروں پر ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے مراثی انیس کو فوقیت حاصل ہے۔

ہومر کی ایلیڈ میں سولہ ہزار، ورجل کی اینیڈ میں دس ہزار، والمیکی کی رامائن میں اڑتالیس ہزار اشعار سے زائد نہیں برخلاف اس کے میر انیس کا کلام اسّی نوّے ہزار اشعار پر مبنی ہے۔ ایلیڈ، اینیڈ اور مہابھارت کے رجال داستان پر عظمت شخصیتیں نہیں ہیں ان کی ذاتی خوبیاں اس درجہ کی نہیں کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیں

نیز مہابھارت کسی خاص فکر کا نتیجہ نہیں، اس کی تہذیب و ترتیب میں متعدد دماغ لگے ہیں اور صدیوں کی کوشش و کاوش کے بعد یہ اس درجہ تک پہونچی ہے۔ پیراڈائز لاسٹ کا موضوع مہتم بالشان نہیں شیکسپیر کے ڈراموں اور فردوسی کے شاہنامے کے موضوع بے حد وسیع ہیں اور ان میں اس قدر متفرق ہستیاں کام کرتی نظر آتی ہیں کہ پڑھنے والا کسی ایک ہی شخص سے کامل ہمدردی پیدا نہیں کر سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رامائن کا موضوع اعلیٰ ہے، اس نے ہندوستان کے ادب و اخلاق کی درستگی میں زبردست حصہ لیا ہے اور اس کے رجال داستان بھی نہایت عظمت مآب شخصیتیں ہیں لیکن وہ ایک طربیہ ہے اور طربیہ حزنیہ سے بہت کم درجہ کا کارنامہ ہوتا ہے"۔۔۔۔ (تنقیدی مقالات صفحات ۲۷۵۔۲۷۷)۔

(اس کے بعد مراثی سے امام حسین علیہ السلام کا کیریکٹر مرتب کیا ہے جس کا نقل کرنا موجب طوالت، لہذا چھوڑ دیا گیا۔)

یہ ہے ایک مقتدر نقاد کی جنچی تلی رائے۔

اس مرثیہ کو "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" میر انیس کا شاہکار کہکر فاروقی صاحب نے اس کی دوبارہ (سہ بارہ؟) دُرگت بنائی ہے۔ پہلے دو بندوں کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"اس تقریر سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ امام کے دل میں ایک عزم ہے اور وہ خنداں پیشانی ("یہ خندہ پیشانی" کی خرابی ہے! اثر) کے ساتھ قربانی کے لئے طیار ہیں مگر تقریر کی زبان اور لہجہ وہ نہیں ہے جو ایسے موقعوں پر ہیروؤں کی ہوتی (کا ہوتا؟) ہے"۔

کوئی پوچھے کہ اگر زبان و لہجہ ہیروؤں کا نہیں ہے تو جناب والا کو علم کیونکر ہوا کہ امام کے دل میں ایک عزم ہے کہ:۔

"رضینا بالقضا" کہکر سب کچھ راہ خدا میں قربان کر دیں۔

یہ دو مصرعے جس میں حضرت زینب کی زبان سے انیس کہتے ہیں:۔

۱۔ "صدقے نمازیوں کے موذن کے میں نثار"۔ ۲۔ "میری طرف سے کوئی بلائیں تو لینے جائے"

نقل کر کے فاروقی صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"ایسی باتوں پر اُن لوگوں کو جو لکھنؤ کی تہذیب اور لکھنوی عورتوں کی بات چیت سے واقف نہیں ہیں بے اختیار ہنسی آجاتی ہے"۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ انیس نے مرثیہ دہقانیوں کے لئے نہیں کہا اور اُن کی کبھی کبھی پر حیرت نہ ہونا چاہئے۔

پھر فرماتے ہیں کہ:۔

"اس کے بعد نماز کا بیان ہے جس میں زیادہ تر بناوٹی زبان سے کام لیا گیا ہے اور تشبیہ و استعارات نے آورد پیدا کر دی ہے"۔

فاروقی صاحب کا خشک مغرب زدہ دماغ بھلا اُن لطافتوں اور اُس معنویت کی کیا قدر کر سکتا ہے جو اس نماز اور نماز کی

مصوری میں ہے۔ ابتدا اس بند سے ہوتی ہے:۔

صف میں ہوا جو نعرۂ قد قامت الصلوٰہ — قایم ہوئی نماز، اُٹھے شاہ کائنات
وہ نور کی صفیں وہ مصلّی ملک صفات — قدموں سے جن کے ملتی تھی آنکھیں رہ نجات
جلوہ تھا تا بہ عرش معلّی حسین کا
مصحف کی لوح تھی کہ مصلّی حسین کا

چوتھے مصرع کی بے پایاں بلاغت کا اندازہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک مضمون کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے ہوگا جس کا عنوان "یادِ حسین علیہ السلام" ہے۔

یہ دعا سورۂ فاتحہ ہے۔۔۔۔ اور وہ نعمت وہ دولت وہ متاع مطلوب و محبوب "الصراط المستقیم" ہے جسکے مانگتے رہنے اور طلب کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے "اھدنا الصراط المستقیم" (خدایا تو ہمیں "الصراط المستقیم" پر چلنے کی توفیق دے)۔ یہ "الصراط المستقیم"، کون سی راہ ہے اور اس سے مقصود کیا ہے؟ اسکی تشریح نہیں کی گئی البتہ یہ بتلایا گیا ہے کہ:۔

"صراط الذین انعمت علیہم" (اُن لوگوں کی راہ اے پروردگار جن پر تو نے انعام کیا)۔ پس اس تصریح سے "صراط مستقیم" وہ راہ ہوئی جو انعام یافتہ لوگوں کی راہ ہے یعنی جن لوگوں پر خدا نے اپنی نعمتیں نازل کی ہیں۔ انہی کی راہِ عمل "الصراط المستقیم" ہوگی۔ چنانچہ سورۂ النساء میں انعام یافتہ جماعتوں کا بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ "انعمت علیہم" میں کن لوگوں کی طرف اشارہ تھا:۔

"ومن یطع اللہ و یطع الرسول فاولائک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصادقین والشہداء والصالحین وحسن اولائک رفیقا" (۴-۷۱) (۴-۶۹؟ اثر)

(اور جن لوگوں نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو وہ سب اُن خوش نصیبوں کے ساتھی ہوجائیں گے جن پر اللہ تعالےٰ نے انعام کیا ہے وہ انبیاء ہیں، صدیقین ہیں، شہداء ہیں، صالحین ہیں۔ جس کسی کو ایسی انعام یافتہ جماعتوں کی معیت ملی تو کیا اچھی ہے اُس کی معیت اور کیا اچھے ہیں اُس کے رفیق)

کیا یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بیان کردہ مطالب کا جوہر انیس کے اس مصرع میں کھنچ آیا ہے:۔

"قدموں سے جن کے ملتی تھی آنکھیں رہ نجات"۔ کیا صراط مستقیم پر چلنے والوں اور اُن کے رفقا کی عظمت کو یوں ظاہر کرنا کہ راہ نجات (صراط مستقیم) اُن کے قدموں سے آنکھیں ملتی ہے، انیس کی شاعری کا معجزہ نہیں ہے؟

نماز کے متعلق چھ بند ہیں نادر اور اچھوتی تشبیہوں سے مزین ہیں، زبان میں اضافہ ہیں۔ پھر فاروقی صاحب نکتہ چینی کرتے ہیں کہ:۔

"ابھی نماز ختم بھی نہ ہونے پاتی ہے (شاید یہی زبان لکھنؤ سے باہر مطبوع و مقبول ہے!) کہ تیر آکر گرنے لگتے ہیں اس پر۔

اکبر سے مُڑ کے کہنے لگے سرورِ زماں — تم کہہ دو جا کے خیمے میں یہ لے پدر کی جاں
باندھے ہے سرکشی پہ کمر لشکرِ گراں — بچوں کو لے کے صحن سے ہٹ جائیں بیبیاں
غفلت میں تیرے کوئی بچہ تلف نہ ہو
ڈر ہے مجھے کہ گردنِ اصغر ہو نہ ہو

امام کی تقریر کا رنگ ابتدائی بندوں کے منافی ہے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ قربانی کا مصمم عزم کئے ہوئے ہیں۔" بیشک قربانی کا عزم مصمم ہے مگر بیچارگی کے ساتھ نہیں بلکہ ایک مجاہد کی حیثیت سے۔ جہاد فی سبیل اللہ سے قبل حفظ جان و آبرو فرض ہے۔ جہاں قربانی کا عزم مصمم کا اظہار ہے وہیں یہ مصرع بھی ہے:۔" ہاں غازیو یہ دن ہے جدال و قتال کا۔"

پھر فرماتے ہیں:۔

"اتنے میں خیمہ کے دروازے سے فضہ کی صدا آتی ہے اور فضہ کی تقریر ایسی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو میدانِ کارزار کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہے۔"

لیجئے، بیچاری فضہ بھی مورد طعن ہو گئی! اُسے میدان کارزار کا اندازہ لگانے سے کیا کام۔ وہ تو حسین اور اطفال حسین کی پروانہ ہے، تیر خیمے کے صحن میں گرتے ہیں تو بے اختیار فریاد کرتی ہے کہ:۔

ہے ہے علی کی بیٹیاں کس جا ہوں گوشہ گیر — اصغر کے گاہوارے تک آکر گرے ہیں تیر
گرمی میں ساری رات تو گھٹ گھٹ کے روئے ہیں
بچے ابھی تو سرد ہوا پا کے سوئے ہیں

فضہ، حضرت فاطمہؑ کی کنیز رہ چکی ہے، اُس کے جذبات کی اس سے بہتر کیا ترجمانی ہو سکتی ہے۔ حضرت خیمے میں تشریف لے جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ حضرت زینب مصروف دعا ہیں۔ دُعا کو سن کے امام فرماتے ہیں:۔

بولے قریب جا کے شہ آسماں جناب — مضطر نہ ہو دعائیں ہیں تم سب کی مستجاب
مغرور ہیں خطا پہ ہیں یہ خانماں خراب — خود جا کے میں دکھاتا ہوں ان کو رہ صواب
موقع نہیں ابھی نہیں فریاد و آہ کا
لاؤ تبرکات رسالت پناہ کا

فاروقی صاحب کو اعتراض ہے کہ "تقریر موقعہ کے لحاظ سے بہت ہلکی ہے۔" کاش وہ نثر ہی میں بتا دیتے کہ اس موقع پر بھاری بھرکم تقریر کا کیا اسلوب ہوتا۔ اُن کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ جب علم آتا ہے تو اُس کے پاس سب

لوگ اسی طرح آتے دکھائے گئے ہیں جیسے لکھنؤ کے گھروں میں علم آنے پر لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ اور اسی قسم کے جملہ اعتراضات یک لخت ناقابل اعتنا ہیں۔ ایک شاعری جس کلچر کی نمایندہ ہوگی ویسا ہی ماحول قایم کیا جائے گا۔ حسین کل دنیائے اسلام کے ہیرو ہیں اور ہر خطہ کے مسلمان اُن کے غم کی یادگار اپنے مخصوص طریقوں سے مناتے ہیں خالص عربی رسوم کا اتباع کیسا کثر و بیشتر کو اُن کا علم بھی نہیں — اس کے بعد یہ بھونڈا طنز ہے کہ :-

"امام حسین کی فوج کے جوانوں کی مدح ہوتی ہے اور آسمان سے حوریں تعریف کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، لیکن یہ تمام تعریفیں صرف ظاہری حسن کی ہیں"۔

یہ بند پڑھئے اور فاروقی صاحب کی اصابت رائے کی داد دیجئے :-

اللہ ری سپاہ خدا کی شکوہ و شان — بجھنے لگے جنود ضلالت کے بھی نشان
کمریں کسے علم کے تلے ہاشمی جوان — دنیا کی زیب، دین کی زینت جہاں کی جان
ایک ایک دو دمان علی کا چراغ تھا
جس کو بہشت پر تھا تفوق وہ باغ تھا

لڑکے وہ سات آٹھ سہی قد سمن عذار — گیسو کسی کے چہرے پہ دو اور کسی کے چار
حیدر کا رعب نرگسی آنکھوں سے آشکار — کھیلیں جو نیمچوں سے کریں شیر کا شکار
تیروں کی سمت چاند سے سینے تنے ہوئے
آئے تھے قتل گاہ میں دولھا بنے ہوئے

غرفوں سے حوریں دیکھ کے کرتی تھیں یہ کلام — دنیا کا باغ بھی ہے عجب پُر فضا مقام
دیکھو درود پڑھ کے سوئے لشکر امام — ہمشکل مصطفےٰ ہے یہی عرش احتشام
رایت لئے وہ لال خدا کے ولی کا ہے
ابتک جہاں میں ساتھ نبی و علی کا ہے

دُنیا سے اُٹھ گئے تھے جو پیغمبر زماں — ہم جانتے تھے حُسن سے خالی ہے سب جہاں
کیونکر سوئے زمیں نہ جھکے پیر آسماں — پیدا کیا ہے حق نے عجب حُسن کا جواں
سب خوبیوں کا خاتمہ بس اس حسیں پہ ہے
محبوب حق ہیں عرش پہ سایہ زمیں پہ ہے

سپاہ خدا، لشکر ضلالت کو توہس نہس کرنے والے، دین کی زینت، دو دمان علی کے چشم و چراغ، رعب حیدری کے ورثہ دار، نیچوں سے کھیلنے والے شیر دل و شیر افگن، تیروں کی سمت سینے تانے ہوئے، جنھیں دیکھ کر حوریں درود پڑھیں، عرش احتشام کہیں، محبوب حق کا سایہ سمجھیں۔ یہ سب ظاہری حسن کی اور صرف ظاہری حسن کی تعریف ہے! — بول بالا نقاد بے مثال و سخن فہم باکمال فاضل علوم مغربیہ، انیس کو حیات جاوید بخشنے کے مدعی محمد احسن فاروقی بالقابہ کا۔ اگر دو چار بھی اُنکے اقران و اماثل پیدا ہو گئے تو اُردو کلچر کا بیڑا پار ہے۔ (ختم)

مرزا یگانہ چنگیزی اثر لکھنوی

عہدِ زار سے اسٹالین تک

پہلی جنگِ عظیم کے بعد کی تاریخ میں روس کا انقلاب بڑی اہم چیز ہے۔ لیکن اس کے سمجھنے میں لوگوں سے یہ غلطی ہوتی ہے کہ وہ اس کو یورپ کا ملک جانتے ہیں اور یورپین معیار ہی سے اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ روس دراصل مشرق کا ملک ہے اور اس کے انقلاب کی صورت بھی وہی تھی جو مشرقی ممالک کے دوسرے انقلابات کی۔ جو بیسویں صدی میں رونما ہوئے۔ اور جن کا پس منظر مغربی طاقتوں کی نفع اندوزی (Exploitation) کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسی نقطۂ نظر سے بالشیوزم کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

زار کے زمانے کا روس

انیسویں صدی میں روس زمینداروں اور کسانوں کا ملک تھا، وہاں کے کسان، زمیندار اور زمین کے غلام تھے اور زمیندار ان کے ویسے ہی آقا و مالک تھے۔ جیسے مویشیوں کے اور دوسری املاک کی طرح کاشتکار اور ان کی خدمات بھی وراثتاً منتقل ہوتی رہتی تھیں۔

۱۸۶۱ء میں زار (اسکندر ثانی) نے اس رواج کو ختم کرنے کے لئے حکم جاری کیا کہ "کسان آزاد ہیں وہ قسطوں پر زمینیں خرید سکتے ہیں اور زمینوں کی قیمت اپنی مزدوری سے ادا کر سکتے ہیں"۔

اگر روس خالص زراعتی ملک ہوتا تو اس حکم کے بعد جس سے تمام کاشتکار مطمئن ہو گئے تھے انقلاب نہ ہونا چاہئے تھا لیکن اسی صدی کے اخیر میں اس کو صنعتی ملک بنانے کی پالیسی بھی اختیار کی گئی۔ اور یہی اصل بنیاد تھی انقلاب کی۔ ۱۹۰۶ء میں روس نے صنعت کو فروغ دینے کے لئے فرانس اور برطانیہ سے صنعتی معاہدے کئے اور ان دونوں ملکوں نے اپنا اپنا سرمایہ لگانے کے لئے تھیلیوں کے منہ کھول دئے۔

حکومتِ زار کی پالیسی یہ تھی کہ مغربی یوروپ سے مصنوعات حاصل کرنے کی بجائے زیادہ مناسب یہ ہے کہ دوسرے ممالک اپنا سرمایہ لگا کر اپنی اپنی مصنوعات یہیں پیدا کریں۔

اس کا نتیجہ ہوا کہ اوکرین اور ڈونٹز میں معدنیات کی کھدائی شروع ہو گئی — ماسکو اور پیٹروگراڈ کے حوالی میں ملکی صنعتوں کے ادارے قایم ہو گئے۔ سامانِ حرب طیار ہونے لگا۔ تاکہ روس جاپان کے خلاف کامیابی سے جنگ کر سکے۔ ۱۹۰۶ء تک ریلوے لائنوں کی ضروریات کے لئے تمام سامان وہیں تیار ہونے لگا اور یہ سلسلہ اتنا وسیع ہو گیا کہ ۱۹۱۴ء تک ۲۵ لاکھ مزدور صنعت گاہوں میں کام کر رہے تھے، اس میں شک نہیں کہ اس طرح صنعت کو کافی ترقی ہوئی لیکن مزدوروں کی حالت بہت خراب تھی۔

ان کے مکان جانوروں کے بھٹ تھے اور ان کی زندگی جانوروں ہی کی طرح کس مپرسی کے عالم میں بسر ہوتی تھی نہ ان کی صحت کا کسی کو خیال، نہ ان کی اولاد کی تعلیم کی طرف کسی کو توجہ۔

روس میں طبقۂ عمال کی یہ سقیم حالت کوئی نئی چیز نہ تھی اس سے پہلے بھی وہ ایسی ہی دردناک زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور اس احساس کی بنا پر ۱۸۹۸ء میں ان کی سوشلسٹ پارٹی قایم ہو چکی تھی، یورپ میں کارل مارکس کی قیادت میں اس سے بہت پہلے ایک بین الاقوامی قسم کی سوشلسٹ جماعت تشکیل پا چکی تھی۔ لیکن جب ۱۸۷۱ء میں پیرس کا مزدور طبقہ اپنی حکومت قایم کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو یہ پہلی بین الاقوامی مجلس ختم ہو گئی۔ اور اس کی جگہ دوسری مجلس نے لے لی۔

لیکن روس کے مزدوروں کی سوشلسٹ پارٹی نے اپنا تعلق اس پہلی بین الاقوامی مجلس سے قایم کر لیا اور اسکو پھر زندگی دینا چاہی انگلستان میں تو روس کی اس سوشلسٹ جماعت کے ممبر ہائڈ پارک میں تقریریں بھی کر سکتے تھے، ممبران پارلیمنٹ کو بھی متوجہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، تجارتی یونین بھی قایم کر رہے تھے۔ لیکن خود روس کے اندر وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اور قلم و زبان دونوں پر مُہر لگا دی گئی تھی پولیس اس تحریک کو کچلنے کے لئے نہایت سختی سے کام لے رہی تھی۔ لوگ چھپ چھپ کر زمین دوز مکانوں میں دروازے بند کر کر کے جلسے کرتے تھے۔ لیکن جہاں کہیں ان کا پتہ چل جاتا تھا پکڑ کر یا تو قتل کر دیا جاتا تھا یا جلاوطن کر کے سائبیریا کی طرف بھیجدیا جاتا تھا۔ انھیں مجرموں میں سے ایک لینن تھا، جو تین سال کے لئے ۱۸۹۶ء میں جلاوطن کیا گیا۔ دوسرا ٹراٹسکی تھا۔ جسے ۱۸ سال کی عمر میں جلاوطنی کی سزا دی گئی اور تیسرا اسٹالین تھا جو بارہا قید و بند کی مصیبت میں مبتلا ہوا۔ بارہا نکل بھاگا اور آخر کار چار سال کے لئے سائبیریا بھیجدیا گیا۔ روس کے انقلاب پسندوں کے لئے یہ زمانہ بڑا نازک تھا، لیکن اتفاق سے اس زمانہ (۱۹۰۵ء) میں جاپان سے جنگ چھڑ گئی اور اس موقع سے فایدہ اُٹھا کر پھر انقلابیوں نے سر اُٹھایا، اسٹرائک ہونے لگے، لوٹ مار شروع ہو گئی اور سینٹ پیٹرزبرگ میں طبقۂ عمال کی کونسل (سوویٹ) قایم ہو گئی اور ٹراٹسکی جو یورپ سے کسی طرح بھاگ کر پھر یہاں آ گیا تھا صدر مقرر ہوا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔

جب دسمبر میں اس سوویٹ کے لیڈر گرفتار کئے جانے لگے تو ماسکو کی سوویٹ نے ۱۹ دسمبر کو ایک عام اسٹرائک کر دیا اور مزدوروں نے حوالی شہر پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اتفاق سے اسی وقت زار کی فوجیں منچوریا سے واپس آ گئیں اور اس تحریک کو کچل دیا گیا اور انقلابی لیڈروں کو پھر جلاوطن کر دیا گیا۔

ان واقعات و حالات سے یہ لوگ اس نتیجہ پر پہونچے کہ صرف ایک ہی ملک کے اندر انقلابی تحریک کا محدود ہونا مفید نہیں ہو سکتا۔ کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ہر ملک میں یہ تحریک شروع کی جائے اور اس کا بہت امکان تھا کیونکہ سرمایہ داروں کے مظالم ہر جگہ ایک ہی سے تھے اور مزدوروں کی حالت تمام دنیا میں یکساں تباہ تھی، مارکس کا نظریہ بھی یہی تھا کہ جب تک ساری دنیا کا مزدور طبقہ متحد ہو کر سرمایہ داری نظام کو ختم کرنے کی کوشش نہ کریگا کامیابی نہیں ہو سکتی۔

۱۹۰۵ء کی انقلابی تحریک کے سلسلہ میں روس کے اندر متعدد انجمنیں مزدوروں کی قایم ہو گئی تھیں۔ لیکن اس کے

دو سال بعد اس جماعت کے دو حصے ہو گئے، ایک بالشیوکی جماعت جو لڑ بھڑ کر انقلاب کو کامیاب بنانا چاہتی تھی اور دوسری وہ جو تدریج کے ساتھ انقلاب چاہتی تھی۔ بالشیوکی جماعت کا قاید لینن تھا۔ اور دوسری جماعت کا مارٹوف ٹراٹسکی نے ان دونوں کے درمیان ایک راہ اپنی الگ اختیار کی تھی۔ ابھی ان دونوں جماعتوں کے جھگڑے طے نہ ہوئے تھے کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہو گئی۔ گو اس سے قبل برطانیہ، فرانس، بلجیم، آسٹریا اور جرمنی کی سوشل ڈاکرٹیک انجمنوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اگر لڑائی شروع ہوئی تو وہ اس میں کوئی حصہ نہ لیں گے۔ لیکن جنگ چھڑ جانے کے بعد سب اس عہد سے پھر گئے، لینن پر ان انجمنوں کی عہد شکنی کا بہت اثر ہوا۔ لیکن وہ مایوس نہیں ہوا اور یورپ میں جہاں جہاں بالشیوکی خیال کی انجمنیں قایم تھیں ان سے خط و کتابت کرتا رہا۔

۱۹۱۷ء کا انقلاب

مارکس بہت پہلے پیش گوئی کر گیا تھا کہ لڑائی کے بعد جب سرمایہ دار طبقہ میں کمزوری پیدا ہو گی تو وہی وقت مزدوروں کی کامیابی کا ہو گا۔ اور مارچ ۱۹۱۷ء میں یہ وقت روس میں آ گیا اور اس قدر اچانک کہ دنیا کو حیرت ہو گئی۔ پٹروگراڈ میں اسٹرائک ہوا اور اس کے تیسرے ہی دن ۲۴ لاکھ مزدوروں کی جماعت پایہ تخت کی سڑکوں پر جمع ہو گئی۔ کاسک فوج طلب کی گئی، لیکن اس نے مزدوروں پر فیر کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری فوجیں آئیں اور انھوں نے بھی پبلک کا ساتھ دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں نے پولیس کے تھانوں پر قبضہ کر لیا۔ زار کی ٹرین پٹروگراڈ سے باہر ہی روک دی گئی اور پایۂ تخت میں آنے سے اسے باز رکھا گیا۔

پھر یہ سب کچھ تو ہو گیا۔ لیکن آیندہ کیا ہونا چاہئے یہ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ زار کو حکومت سے معزول کر دینا تو آسان تھا لیکن زار کی جگہ کسی دوسری حکومت کی تنظیم معمولی بات نہ تھی، سوویٹ کونسلیں تو انھوں نے منتخب کر لیں لیکن یہ سب اسی اعتدال پسند جماعت کی تھیں جو تدریج و سکون کے ساتھ انقلاب کی حامی تھیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں نے پھر سرمایہ دار بورژوا طبقہ کے ہاتھ میں اختیار دیدئے اور کوئی اصولی بات ان سے طے نہ کرائی۔

اس وقت لینن جلاوطنی کا زمانہ زیورچ (جرمنی) میں بسر کر رہا تھا۔ اس نے مہینوں کی کوشش کے بعد وہاں سے رہائی پائی اور جرمن حکومت نے اُسے معہ دوسرے انقلابیوں کے روس بھیجدینے پر اس لئے رضامندی ظاہر کر دی کہ ممکن ہے اس کے اثر سے روس کی موجودہ صلح پسند پارٹی کو اور زیادہ تقویت پہونچے۔

اپریل میں لینن کی گاڑی جب پٹروگراڈ پہونچی تو سوشلسٹ جماعت کا بڑا گروہ اس کے خیر مقدم کے لئے اسٹیشن پر موجود تھا اور سمجھ رہا تھا کہ اب لینن کی آمد سے امن پسند پارٹی کو تقویت پہونچے گی، لیکن ریل سے اُترتے ہی جو سب سے پہلی تقریر اس نے کی وہ بہت مایوس کن تھی اور پارٹی کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ لینن نے مبارکباد کی جگہ سخت لعن طعن کی اور کہا کہ "تم لوگوں نے سرمایہ دار جماعت کے ہاتھ میں اقتدار دیکر انقلابی تحریک کے ساتھ غداری کی ہے۔ ضرورت ہے کہ از سر نو اس تحریک کو زندہ کیا جائے اور موجودہ نظام حکومت کو توڑ کر وہی اصل مطالبہ سامنے رکھا جائے کہ حکومت سوویٹ کی اور زمین کسان کی ——"

لوگوں نے یہ تقریر سُن کر سمجھا کہ لینن کا دماغ خراب ہو گیا ہے یا یہ کہ وہ روس کے موجودہ حالات سے واقف نہیں ہے۔

اس لئے وہ بدستور موجودہ حکومت کا ساتھ دیتے رہے اور منتظر رہے کہ شاید لینن بھی اپنی رائے بدل دے گا۔

اس وقت یہاں کی موجودہ حکومت کی بقا اس پر منحصر تھی کہ وہ لڑائی کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھے۔ کیونکہ اسکے نیویک زار کی ناکامی کا سبب یہی تھا کہ وہ ملک کو لڑائی کے لئے طیار نہ کر سکا، چنانچہ اس نے فوجوں میں بھرتی شروع کر دی اور لاکھوں آدمی محاذِ جنگ پر بھیجدئے۔ لیکن یہ صرف آدمی تھے۔ سپاہی نہ تھے نہ ان کے پاس کافی اسلحہ تھا۔ نہ صحت، نہ ہمت، نتیجہ یہ ہوا کہ پروشیا کی دلدلوں اور پولینڈ کی خندقوں میں لاکھوں روسی ختم ہو گئے اور جو بچ رہے انھوں نے بھاگنا شروع کیا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جنوری ۱۹۱۷ء میں ۱۰ لاکھ سے زیادہ روسی سپاہی محاذِ جنگ چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ چاہئے تھا کہ حکومت اس سے درس لیتی لیکن اس نے پھر بھی جنگ کو جاری رکھا اور اس کا نتیجہ بھی وہی ہوا۔ یعنی آخر کار فوج نے بغاوت کر دی اور مزدوروں کے ساتھ مل کر "سوویٹ اقتدار" کا مطالبہ کرنے لگی۔

کرنسکی کی حکومت نے پھر انقلابیوں کی پکڑ دھکڑ شروع کی، لینن اور اس کے چند شرکاء چھپ گئے اور بہت سے جیل بھیجدئے گئے۔ لینن کے ساتھیوں نے اس سے کہا کہ حکومت کو ضرب پہونچانے کا یہی وقت ہے لیکن اس نے جواب دیا کہ "ابھی وقت نہیں آیا۔ اور کرنسکی اپنی قبر اچھی طرح کھود نہیں پایا ہے"۔ لیکن زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ وہ وقت آیا اور سیلاب کی طرح آیا۔

۲۳ اکتوبر کو لینن نے ایک خفیہ جلسہ کر کے طے کیا کہ "دو ہفتہ کے اندر ہم کو حکومت کا تختہ اُلٹ دینا ہے"۔ ہر چند یہ زمانہ بہت تھوڑا تھا۔ لیکن پھر بھی جس طرح ہو سکا خفیہ خفیہ سارے انتظامات ہونے لگے اور ۷ نومبر کو رات کے ۲ بجے بالشیوکوں نے تمام اہم چوکیوں پر قبضہ کرنا شروع کیا، اور رات تک کرنسکی کی حکومت ختم ہو گئی۔

لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ خون کا ایک قطرہ بھی نہ بہا اور سب کچھ نہایت امن و سکون کے ساتھ ہو گیا۔

جب پیٹروگراڈ پر قبضہ ہو گیا تو یہ لہر ماسکو کی طرف بڑھی اور وہاں مقابلہ بھی ہوا۔ لیکن آخر کار سوویٹ پارٹی کو کامیابی ہوئی اور اس کے بعد دوسرے اضلاع میں بھی یہ تحریک کامیاب ہوتی چلی گئی۔

لینن نے اقتدار پاتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ زمین کاشتکار کی ہے اور اس لئے پورے کاشتکار طبقہ کی اسے حمایت حاصل ہو گئی لیکن سب سے بڑا سوال شہری آبادی کے لئے فراہمی غذا کا تھا۔ اس لئے لینن نے تمام وہ راشن جو فوج کے لئے کرنسکی نے محفوظ کر رکھا تھا تقسیم کرنا شروع کر دیا۔

صلحنامہ برسٹ لٹوسک

لینن کے سامنے اب سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ اس لڑائی کو کس طرح ختم کیا جائے کیونکہ روس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ ایک دن بھی لڑائی جاری رکھ سکے۔ آخر کار اس نے ٹروٹسکی کو پیغام صلح دیکر جرمنی روانہ کیا اور جرمنی نے روس کی کمزوری سے پورا فایدہ اُٹھایا۔ جرمنی نے کہا کہ ہم روس پر حملہ کا خیال اسوقت ترک کر سکتے ہیں جب ہماری شرائط مان لی جائیں اور آخر کار روس کو ماننا پڑیں۔

ان شرایط کی رو سے آرمینا۔ اوکرین اور بالٹک ریاستیں روس کے ہاتھ سے نکل گئیں اور اس طرح روس کی چوتھائی

آبادی، ایک تہائی کارخانے، تین چوتھائی کوئلہ کی معدنیات اور تمام زرخیز علاقے جرمنی کے قبضہ میں آگئے۔

بالشیوکوں نے لینن سے اصرار بھی کیا کہ ان شرائط کو رد کر دینا چاہئے۔ لیکن لینن نے کہا کہ اس وقت امن کی جو قیمت دینا پڑے کم ہے۔ علاوہ اس کے یہ بھی یقین ہے کہ جرمن ان علاقوں کو ہضم نہ کر سکے گا، اور لینن کا یہ خیال بالکل صحیح نکلا۔ کیونکہ اس کے چند ماہ بعد ہی جرمن شہنشاہیت ختم ہوگئی اور یہ صلحنامہ بیکار ہو کر رہ گیا۔ لیکن اس سلسلہ میں روس کے اور علاقے بھی (فن لینڈ، اسٹونیا لیٹویا، لتھوانیا اور پولینڈ کا بڑا حصہ) اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

خانہ جنگی لیکن جرمنی سے صلح کے معنی یہ تھے کہ روس نے اتحادی قوموں سے جنگ مول لے لی۔ اتحادیوں کے بہت بڑے بڑے ذخیرے سامانِ حرب کے جو روس میں موجود تھے وہ روس کے قبضہ میں چلے گئے اور برطانیہ و فرانس کا جو سرمایہ کروڑوں روپے کا روس میں لگا ہوا تھا وہ ڈوب گیا اور ان حکومتوں کا جو پچھلا قرض تھا اس کی ادائی سے بھی سوویٹ حکومت نے انکار کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اتحادی قوموں کیلئے اسکے سوا کوئی چارہ نہ تھا وہ روس کی کمیونسٹ حکومت کے خلاف قدم اٹھائیں، چنانچہ انھوں نے ان تمام سفید فام روسیوں کو جو کمیونسٹوں کے خلاف تھے مدد دینا شروع کی اور ۱۹۱۸ء میں روس نرغہ میں آ گیا۔

مغرب میں ۵۰۰۰۰ پولستانی اور ۷۰۰۰۰ رومانوی فوج روس پر حملہ کرنے کے لئے طیار تھی۔ شمال کی فوجیں اور جنوب میں فرانس کی فوجیں ڈیرا ڈالے پڑی تھیں۔ مشرق میں سفید فام روسیوں نے زیکوسلوکیہ کے ۵۰ ہزار سپاہیوں کی مدد سے خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ سائبیریا میں امیرالبحر کولچک فوج طیار کر رہا تھا اور جاپانیوں کو مدد دے رہا تھا جو ساحل پیفک سے مغرب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ روس اس وقت سخت مصیبت میں مبتلا تھا، اور کوئی صورت ان مشکلات سے نکلنے کی اسے نظر نہ آتی تھی۔ لیکن شاید قدرت اس کی طرفدار تھی اور اس کی تباہی نہ چاہتی تھی۔ کیونکہ چند دن بعد ہی ادھر بیرونی طاقتوں نے یکے بعد دیگرے سفید روسیوں کا ساتھ دینا چھوڑ دیا اور ادھر مغربی یورپ میں جرمنی کو ایسی شکست ہوئی کہ اوکرین کا علاقہ اسے چھوڑنا پڑا

اس واقعہ سے فرانس کو یہ توقع پیدا ہو گئی کہ اوکرین اس کی تولیت میں آجائے گا اور بحر اسود پر اس کا اقتدار قایم ہو جائیگا لیکن ۱۹۱۹ء میں پیرس سے احکام پہونچے کہ تین دن کے اندر روسی علاقہ خالی کر دیا جائے اور فرانسیسی فوجیں اپنی ۳۰ آبدوز کشتیوں کو تباہ کر کے (اس خیال سے کہ مبادا روسی حکومت کے ہاتھ آجائیں) واپس چلی گئیں۔ اس کے بعد برطانیہ نے بھی سفید روسیوں کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنی ۲۸ ہزار فوج کو وہاں سے واپس بلا لیا۔ اب روسی علاقہ میں صرف جاپان کی فوجیں رہ گئیں جو ولاڈی واسٹک اور مشرقی چین کی ریلوے پر قابض ہونا چاہتی تھیں۔

ان حالات نے روس کو ذرا اطمینان کی سانس لینے کا موقعہ دیا۔ کیونکہ اب سفید روسیوں کے علاوہ کوئی اور دشمن سامنے نہ تھا ۱۹۱۹ء میں سُرخ فوج کی کمان ٹراٹسکی کو دیجا چکی تھی، وہ سپاہی نہ تھا۔ لیکن تنظیم کی اہلیت اس میں بہت زبردست تھی۔ اس نے بچی کھچی شاہی فوج اور کسانوں مزدوروں کی ایک فوج ۵ لاکھ کی بنالی تھی جو صرف نام کی فوج تھی۔ ذخائر حرب کی تو کمی نہ تھی

لیکن اسے لانے لیجانے کے ذرائع بہت ناقص و ناکافی تھے، پھر بھی ٹراٹسکی ۱۶ محاذ پر جنگ کر رہا تھا۔ ٹراٹسکی کی محنت کا یہ حال تھا کہ اس نے پورے ڈھائی سال ریل ہی میں بسر کئے ایک ایک جہاز پر جا کر سپاہیوں کی ہمت بڑھاتا تھا اور جنگ کے نقشے تیار کرتا تھا اس کی بڑی کوشش یہ تھی کہ لوگوں میں شکست خوردگی کی ذہنیت پیدا نہ ہونے پائے چنانچہ وہ اپنی شخصیت۔ اپنی تقریروں اور اپنے غیر معمولی عزم و ہمت سے کام لے کر سرخ فوجوں کی ہمت بڑھاتا رہتا تھا اور کسی نہ کسی طرح اس نے ساکھ قایم کر رکھی تھی۔ اسٹالین اس بات کا مخالف تھا کہ کبھی کبھی زار شاہی فوج سے کام لیا جائے، کیونکہ اس کا کوئی اعتبار نہ تھا چنانچہ اس نے لینن سے کہا بھی کہ ٹراٹسکی کے ہاتھ سے کمان لے لی جائے۔ لیکن لینن نہیں مانا۔

۱۹۱۹ء میں سفید روسیوں نے حملہ کیا اور کالچک، ماسکو کی طرف بڑھا۔ اِدھر ڈنکن نے جنوب کی طرف سے بڑھنا شروع کیا اور روس کے ایک تہائی علاقہ سے بھی آگے بڑھ گیا، ایک اور جنرل نے پٹروگراڈ کا رُخ کیا، لینن نے یہ یلغار دیکھ کر راجدھانی چھوڑ دینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن اسٹالین نے اس کی مخالفت کی اور کسی نہ کسی طرح ایک فوج جمع کر کے پٹروگراڈ کی طرف بڑھنے والی سپاہ کا مقابلہ کیا اور فروری ۱۹۲۰ء تک کئی شہر دشمنوں سے چھین لئے دشمن کا جنرل تو خیر کسی نہ کسی طرح جان بچا کر نکل گیا لیکن اسٹالین نے سفید روسیوں کے ۱۵۰۰ افسروں کو پکڑ کر تہ تیغ کر دیا۔ اسی مہینہ میں کولچک بھی گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا اور ڈنکن کی فوج بھی منتشر ہو گئی۔

سفید روسیوں کی شکست کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ان کے تمام کمانڈر متحد الخیال نہ تھے اور ایک دوسرے کی مخالفت کرتے تھے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ بیرونی ملکوں نے ان کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

۱۹۲۰ء میں تقریباً سارا مطلع صاف ہو گیا تھا اور اب صرف پولستانی فوجوں سے مقابلہ باقی رہ گیا تھا روسی فوجیں دو بہترین جرنیلوں کی سرکردگی میں روانہ کی گئیں اور دشمن سے بڑا سخت مقابلہ ہوا۔ اس لڑائی میں روس کو کافی نقصان پہونچا اور دو جینے میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ سُرخ سپاہی کام آئے۔

آخر کار اکتوبر ۱۹۲۰ء میں پولینڈ سے صلح ہو گئی اور اس طرح روس کی خانہ جنگی ختم ہوئی۔

جنگی کمیونزم روس نے یہ لڑائی جس طریقہ سے لڑی اسے جنگی کمیونزم کہتے ہیں یہ کمیونزم سے بالکل علٰحدہ چیز ہے کمیونزم میں نہ ڈکٹیٹر شپ ہے نہ جماعتی تفریق، لیکن جنگی کمیونزم نہایت سخت ڈکٹیٹر شپ تھی، جس میں فوجی بھرتی کے علاوہ تمام املاک، کاشت اور تجارت حکومت کی ملکیت قرار دیدی گئی، اور کاشتکاروں سے غلّہ کی وصولی میں بہت سختی سے کام لیا گیا۔ پھر ان ترکیبوں سے سول وار تو روس نے ختم کر دی لیکن کاشتکاروں کی جماعت حکومت کی مخالف ہو گئی۔ کیونکہ سب سے زیادہ تکلیف اسی کو پہونچی تھی۔

بدقسمتی سے ۱۹۲۱ء میں فصلیں بھی برفباری سے تباہ ہو گئیں اور لاکھوں کسان فاقہ سے مر گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالشیوک حکومت کی مخالفت پھر شروع ہو گئی اور ۱۹۲۱ء کے موسم بہار تک چاروں طرف پھیل گئی۔

لینن کے لئے ان حالات کے پیشِ نظر اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ جنگی کمیونزم کی اسکیم کو منسوخ کر کے پھر وہی پچھلا طریقہ رائج کیا جائے جس کی رو سے لوگوں کو پرائیویٹ تجارت کے حقوق حاصل تھے۔ لینن کے ساتھیوں نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ مارکسی اصول کے خلاف ہے۔

لیکن لینن نے رفتہ رفتہ سب کو راضی کر لیا اور ایک نئی اقتصادی پالیسی قایم کی جس کی رو سے زبردستی غلہ وصول کرنا بند کیا گیا اور کسانوں کو اجازت دی گئی کہ وہ کھلے بازار میں غلہ فروخت کریں۔ بشرطیکہ ٹیکس ادا کر دیا جائے۔ حکومت نے صنعتی اداروں پر سے بھی اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور چھوٹے چھوٹے کارخانے مثل سابق کام کرنے لگے۔ بیرونی سرمایہ داروں کو بھی اجازت دی گئی کہ وہ اپنا روپیہ کاروبار میں لگائیں۔ بڑے بڑے کارخانوں کو ٹرسٹ میں تبدیل کر دیا گیا۔ زار کے سکہ کی جگہ روبل کی نئی کرنسی قایم کی گئی۔ کوآپریٹو سوسائیٹیاں بنائی گئیں اور سرکاری بنک قایم کیا گیا۔

ان تمام اصلاحوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرائیویٹ سرمایہ دار کافی دولتمند ہو گئے۔ بعض ہوشیار کاشتکاروں نے ہزاروں ایکڑ زمین کاشت کر کے اچھی خاصی زمیندارانہ حیثیت بنالی اور اس طرح دیہات میں دو قسم کے کسان پیدا ہو گئے۔ ایک دولت مند دوسرے غریب، حکومت نے اس تفریق کو دور کرنے کے لئے خوشحال کاشتکاروں پر ٹیکس لگائے۔ گو اس سے کوئی خاص نتیجہ اس کے سوا برآمد نہ ہوا کہ حکومت کے دشمن کچھ اور بڑھ گئے۔

ان تمام باتوں سے لینن کا مقصود یہ تھا، کہ حکومت کو ذرا اطمینان کی سانس لینے کا موقعہ ملے تو وہ اپنی اس اسکیم کو نافذ کرے جس کی رو سے تمام پرائیویٹ ملکیت کو ختم کر کے صرف حکومت ہی کو ملک کا تنہا سرمایہ دار قرار دینا تھا۔ اور ان عارضی انتظامات سے لینن کو اس کا کافی موقعہ مل گیا۔

سوویٹ جمہوریتوں کا قیام

۱۹۲۲ء میں روس نے اپنے جدید سیاسی کانسٹی ٹیوشن کا اعلان کیا جس کی رو سے روس کی حکومت۔ وفاقی حکومت میں تبدیل کر دی گئی۔ وفاقی حکومت سے مراد ایسی حکومت تھی جس میں ملک کی مختلف آزاد جمہوریتیں مرکزی حکومت کے ساتھ شامل ہو سکیں۔

اس مقصد کے لئے سات سوویٹ جمہوریتیں قایم کی گئیں ان میں سب سے بڑی جمہوریت روس کی جمہوریت تھی جو مرکزی حیثیت رکھتی تھی، یہ کولنسک سے لے کر پاسفک تک اور لینن گراڈ (پیٹروگراڈ) سے لیکر کوہ قاف تک وسیع تھی۔ اس کی آبادی ۱۹۲۶ء میں ۱۰ کروڑ تھی اس کے اندر سات آزاد جمہوریتیں اور قایم کی گئیں، جو آبادی، تہذیب اور نسلی حیثیت سے باہم گر مختلف تھیں ہمیں سب سے زیادہ اہم ایک جمہوریت سفید روسیوں کی ۵۰ لاکھ آبادی کی تھی۔ اور دوسری اکرین کی جس کی آبادی ۳ کروڑ ہے۔ اکرین کے باشندے بہ لحاظ نسل و زبان روسیوں سے بالکل علٰحدہ ہیں اور یہاں کا علاقہ بڑا زرخیز ہے۔ جس پر جرمن، فرانس، پولینڈ اور رومانیہ سب کی نگاہ رہی ہے — ایک جمہوریت ماوراء قفقاز کے علاقہ میں بھی قایم کی گئی جس کے اہم مقامات آذربیجان، جارجیا اور آرمینیا ہیں اور ان تینوں مقامات کی آبادی بہ لحاظ نسل و قوم ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

یہ جمہوریت اپنی معدنی پٹرولی پیداوار کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے — ان کے علاوہ تین جمہوریتیں اور قایم کی گئیں جو زیادہ اہم نہ تھیں۔ ایک اُزبکستان دوسری ترکمانستان اور تیسری تاجکستان۔ یہ تینوں پہاڑی علاقے ہیں۔ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ ان کی سرحدیں، ایران، افغانستان اور پاکستان سے ملتی ہیں۔ یہ علاقے ماسکو سے بہت دور ہیں۔ لیکن پھر بھی یہاں کے مسلمانوں کی حالت ایسی ہے کہ ایران اور افغانستان کے مسلمان ان پر رشک کرتے ہیں۔

زار کے زمانہ میں بھی قومی تفریق کو مٹانے کا سوال پیدا ہوا تھا، لیکن اس کی تکمیل ہوئی، سوویٹ حکومت میں اور تمام یونینوں کو اسکی اجازت دی گئی کہ وہ خود مختارانہ حیثیت سے اپنے علاقہ کا انتظام جس طرح چاہیں کریں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی یونین سوویٹ جمہوریت سے علٰحدہ ہونا چاہے تو وہ اس کی بھی مجاز ہے، یہاں کی تمام قوموں کو اپنی زبان، اپنی تہذیب و معاشرت کے تحفظ کا پورا اختیار حاصل ہے۔ لیکن مارکسی اصول سے ہٹنے کا کسی کو اختیار نہیں — مارکسی نظریہ یہ ہے کہ "سرمایہ داری سے ہٹ کر اشتراکیت کی طرف آنے کی صورت صرف یہ ہے کہ حکومت مزدور (پرولتاری) جماعت کے ہاتھ میں ہو اور اس نظریہ کی تکمیل کے لئے ۱۹۱۷ء میں وہاں ایک سیاسی محکمہ قایم کیا گیا جسے (سنہ ۱۹۲۲ء G.P.U.) کہتے ہیں۔ اس محکمہ کے قیام کا مقصود یہ تھا کہ سوویٹ یونین کے اغراض و مقاصد کے خلاف ہر تحریک کو سختی سے کچل دیا جائے۔ اس ادارے کی داستانیں بہت طویل ہیں اور اس کو کافی بدنام کیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر سوویٹ حکومت اتنی سختی سے کام نہ لیتی تو اس کا قیام مشکل تھا۔

اس ادارے نے چاروں طرف خفیہ پولیس کا جال بچھا دیا اور جس شخص پر ذرا سا بھی شبہ ہوا اُسے گرفتار کر لیا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں ڈھائی لاکھ غدار گرفتار کئے گئے۔

لینن کی موت

سوویٹ حکومت کی تاریخ میں لینن کو پیغمبر کا سا درجہ حاصل ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ انقلابِ روس کا بانی تھا (کیونکہ اگر وہ نہ ہوتا تو بھی انقلاب ہو کر رہتا) بلکہ محض اس لئے کہ اس تحریک کی بڑی کامیاب قیادت کی۔ اسی کا اثر تھا کہ روس کی پرانی سوشلسٹ پارٹی نے زاریت کے خلاف محاذ قایم کیا اور یہ اسی کی قابلیت تھی کہ روس کی راہ دھانی پر بغیر ایک قطرہ خون بہائے، کمیونسٹ جماعت کا قبضہ ہو گیا — اس نے روس کو امپریل دار سے نکالا، اس نے کسانوں کو زمین دیکر انقلاب کا حامی بنایا، اس نے اتحادیوں کی مداخلت سے اپنے ملک کو بچایا، سول جنگ کے زمانہ میں ملک کو سلامت نکال لے گیا۔ جنگی اشتراکیت (اور کمیونزم) کو ختم کر کے اس نے نئی اقتصادی پالیسی متعین کر کے ملک کو فاقہ کی مصیبت سے بچایا۔

۱۹۱۷ء میں روس کی قیادت کا بار اس نے اپنے سر لیا اور اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اس کو سنبھالے رکھا۔ خود اسکی پارٹی میں کافی اختلاف و تضاد تھا۔ لیکن اس نے کسی کو اُبھرنے کا موقعہ نہ دیا اور اپنی اسکیم کی تمام جزئیات کو سامنے رکھ کر اس طرح پورا کیا کہ شاید ایک پورا محکمہ اسے اس خوبی سے انجام نہ دے سکتا۔ ظاہری شکل و صورت کے لحاظ سے وہ کوئی خصوصیت نہ رکھتا۔ ایک پستہ قد خاموش قسم کا معمولی انسان، لیکن اس کی روحانی قوت اتنی زبردست تھی کہ سب اسکے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے تھے۔

اس کی محنت و جفاکشی کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۱۸ء میں اس پر گولی چلائی گئی اور

گولی گردن میں پیوست ہوگئی جس کا آپریشن نہ ہوسکتا تھا۔ لیکن وہ برسوں تک گولی اپنی گردن میں لئے ہوئے بدستور رات دن کام کرتا رہا۔ مئی ۱۹۲۲ء میں فالج کا دورہ اس پر پڑا اور باوجود ڈاکٹروں کے منع کرنے کے اس نے کام کرنا نہیں چھوڑا۔ ۱۹۲۳ء میں دوسرا دورہ پڑا جو زیادہ سخت تھا اور قوتِ گویائی بھی جاتی رہی اور مجبوراً اسے ایک گاؤں میں آرام لینے کے لئے جانا پڑا، لیکن وہ یہیں سے لیٹے لیٹے احکام صادر کرتا رہتا تھا تاکہ اس کی قایم کی ہوئی اقتصادی پالیسی ناکام نہ ہو۔ اس زمانہ میں اس نے روسی انڈسٹری کی اسکیم چلائی اور اسٹالین کی غیر روسی قوموں کے خلاف تشدد سے روکتا رہا۔

اسٹالین یا ٹراٹسکی

جب ۱۹۲۴ء میں اس کا انتقال ہوگیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کا جانشین کون ہو۔ اس وقت کمیونسٹ پارٹی کے اندرونی حلقے میں چار شخص تھے جن پر نگاہ پڑتی تھی۔ ایک زنوویف جو اچھا سیاست داں سمجھا جاتا تھا۔ دوسرا کامینف جو بڑا زبردست مقرر تھا۔ لیکن ان دونوں کی کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا، تیسرا اسٹالین (پارٹی کا سکریٹری) جسکے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ کارکن تو اچھا ہے، لیکن قائد کی حیثیت سے کامیاب نہیں ہوسکتا۔ چوتھا ٹراٹسکی جو فطرتاً قیادت کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اور لینن کے بعد اسی کی دوسری شخصیت تسلیم کی جاتی تھی۔ اس لئے خیال یہی تھا کہ ٹراٹسکی اس کا جانشین ہوگا لیکن ٹراٹسکی نے سخت گیر پالیسی سے اپنے دشمن بہت بنالئے تھے۔ اور لینن کی موت سے پہلے ہی لوگوں نے اسکے مارنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ جب ۱۹۲۴ء میں وہ بیمار پڑا تو پورے سال بھر اس کی جگہ تین آدمیوں نے کام کیا۔ جن میں سے ایک اسٹالین بھی تھا۔ اور جب ۱۹۲۵ء میں وہ اچھا ہوا تو بھی اُسے وزارتِ جنگ کا چارج نہیں ملا۔ بلکہ بجلی اور دوسرے سائنٹفک محکمے اس کے سپرد کردئے جن کو اس نے خوشی سے قبول کرلیا — اسی دوران میں اسٹالین اور اسکے ساتھیوں نے اپنی پالیسی بدل کر بیرونی سرمایہ داروں کو مراعات دینی شروع کیں۔ تاجروں کو بھی ذاتی طور پر تجارت کرنے اور روپیہ کمانے کا موقعہ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اضلاع میں دولتمند طبقہ پھر پیدا ہونے لگا۔ اور سرمایہ و ملکیت پیدا کرنے والی جماعت اُبھرنے لگی۔ ٹراٹسکی نے یہ دیکھ کر اعتراض کیا اور ایک مخالف پارٹی بناکر اس کا مقابلہ کرنا چاہا۔ اور اس بات پر زور دیا کہ ہمارا مقصود اشتراکیت کو ساری دنیا میں پھیلانا ہے۔ کیونکہ ہمارا ہمدردیاں دنیا کے تمام مزدوروں کے ساتھ ہیں۔ لیکن اسٹالین جسکی حیثیت کمیونسٹ پارٹی میں اب کافی مضبوط ہوچکی تھی، ٹراٹسکی کی پالیسی کے خلاف تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ساری دُنیا میں اشتراکی انقلاب پیدا کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ کیونکہ ترکی اشتراکیت کو رد کرچکا تھا۔ برطانیہ میں جو عام اسٹرائک ہوا تھا وہ ناکام رہا۔ چین سے کمیونسٹ جماعت نکال دی گئی تھی اور پھر روس کے سامنے اسکے اندرونی مسایل اتنے اُلجھے ہوئے تھے کہ بیرونی معاملات میں دخل دینے کا موقعہ نہ تھا۔ ... آخر کار ۱۹۲۷ء میں اسٹالین، ٹراٹسکی کو علٰحدہ کرنے میں کامیاب ہوگیا اور لینن کی جگہ اس نے لی — اسٹالین نے اقتدار حاصل کرتے ہی ملک کی اقتصادیات کو اپنے قابو میں لانے کی کوشش شروع کردی اور وہ اس لئے کہ عام پیداوار حاصل کرنے کے لئے پرائیویٹ کارخانوں کی راہ میں موانع پیدا کئے تاکہ وہ ٹرسٹ میں شامل ہونے پر مجبور ہوں اور جب اس طرح ٹرسٹ بن گئے تو اس نے اس کا تعلق سنڈیکیٹ سے کردیا اور اس طرح روس کی انڈسٹری حکومت کے ہاتھ میں آگئی۔

(ادب لطیف)

نیاز فتحپوری

اشارات[1]

(غالب کے مطالعہ کے لئے)

مرزا کا نسب نامہ — مرزا کا یہ صحیح نسب نامہ ہے جسے خواجہ قمر الدین خاں صاحب راقم مرحوم نے جو مرزا کے بہت قریبی عزیز تھے ۱۹۰۵ء میں لکھا تھا، اسی کے ساتھ ایک شرح بھی مرزا کے کلام میں لکھی تھی، جو نسب نامہ کے ساتھ شایع کرنا چاہتے تھے مگر زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے نہ شرح شایع کر سکے نہ نسب نامہ۔ اُن کے پوتے مرزا رفیق بیگ نے نسب نامے کا کچھ حصہ رسالہ اُردو بابت ماہ جولائی ۱۹۲۲ء میں شایع کرایا ہے۔

مرزا کا ایک غیر مطبوعہ خط — بریلی میں مرزا کے ایک شاگرد تھے اُن کے کلام پر مرزا کی اصلاح کا بلاک مرزا کے خط کے بلاک کے ساتھ رسالہ آجکل دہلی سالنامہ ۱۹۴۹ء میں شایع ہوا ہے۔

مرزا کے دو غیر مطبوعہ خط — رسالہ اُردو بابت ماہ اپریل ۱۹۴۲ء میں شایع ہوئے ہیں پہلے خط کے نیچے غالب، اور دوسرے کے نیچے اسد اللہ لکھا ہوا ہے۔ ان خطوں کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب کی رائے یہ ہے کہ پہلا خط ملکہ وکٹوریہ کے نام درخواست ہے، دوسرا خط کسی شہزادے کی شادی کے متعلق ہے۔ ممکن ہے شہزادہ جواں بخت کی شادی سے تعلق رکھتا ہو جس کے لئے مرزا نے سہرا لکھا تھا یہ دونوں خط ہنگامۂ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے معلوم ہوتے ہیں۔

مرزا کا غیر مطبوعہ کلام

گئی ہیں سال کے رشتہ میں بیس بار گرہ — ابھی حساب میں باقی ہیں سو ہزار گرہ
گرہ کی ہے یہی گنتی کہ تا بہ روز شمار — ہوا کرے گی ہر اک سال آشکار گرہ

یہ اشعار اس قصیدے کے ہیں جو مرزا نے مہاراجہ الور کی تقریب سالگرہ کی تہنیت میں کہا تھا اور قصیدہ رسالہ اُردو بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں ہاشمی صاحب کے مضمون "فلسفۂ غالب" میں شایع ہو چکا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک منظوم خط بھی ہے جو مرزا نے پنجاب کے لفٹنٹ گورنر کو بھیجا تھا۔

کچھ متفرق اشعار غزل رسالہ معیار پٹنہ بابت ماہ مئی ۱۹۳۶ء میں بھی شایع ہوئے ہیں۔ دو ایک یہ ہیں:—

دیکھتا ہوں اُسے تھی جس کی تمنا مجھ کو — آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

---

[1] اس سلسلہ کی دو قسطیں اس سے قبل مارچ اور مئی کے نگار میں شایع ہو چکی ہیں۔

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لئے اسدؔ ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

غالب کے لطیفے — اس کے مرتب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبر آبادی ہیں جو منشی غلام غوث بے خبر کی بیوی کے سگے بھتیجے ہیں۔ اس نسبت خاص سے مفتی صاحب کو غالب کے حالات اور واقعات سے جس قدر واقفیت ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۴۷ء میں آگرہ اخبار پریس آگرہ میں چھپا ہے۔ اس میں بعض لطیفے ایسے بھی ہیں جن سے مرزا کی سیرت اور کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

نادرات غالب — ۱۹۴۷ء میں پہلی بار مشہور پریس کراچی نے چھاپا ہے اور "ادارۂ نادرات" کراچی نے شایع کیا ہے اس کے مرتب مرزا کے محبوب "میرن" صاحب کے نواسے آفاق حسین آفاقؔ دہلوی ہیں۔ جنھوں نے اپنے مقدمے اور حواشی کے اضافے کے ساتھ یہ مجموعہ شایع کرایا ہے۔

اس میں بہت سی ایسی کار آمد معلومات اور باتیں ملتی ہیں جو غالب کے کسی اور تذکرہ میں نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ بہت سی ایسی باتیں بھی پائی جاتی ہیں جو محل غور ہیں۔

دیوانِ غالب — "شاعرِ مزدور" احسان دانش نے مرتب کیا ہے۔ اس دیوان میں مرزا کے کلام کی شرح بھی ہے اور ان کی سوانح حیات بھی۔ احسان صاحب کے لفظوں میں یہ شرح "کاوشِ مجبور" ہے یہ دیوان فاروقی پریس دہلی میں چھپا ہے، سنہ طباعت درج نہیں ہے۔

متفرقات غالب — مرزا کے ۹۴ فارسی خط اور کئی فارسی اور اردو نظموں کا مجموعہ ہے۔ جو سلسلۂ مطبوعات کتاب خانۂ رام پور کا آٹھواں نمبر ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستانی پریس رام پور سے شایع ہوا ہے۔ اس کے مرتب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی لکھنوی ہیں جو ادیب بھی ہیں اور محقق بھی۔

اشک و رشک غالب — اس کے مرتب سید ظہیر الدین صاحب علوی ہیں جو اپنے کو "غالب پرست" کہتے ہیں ان کا بہ قلم خود بیان ہے کہ مرزا کے کلام پر ان کا یہ نقد و تبصرہ نئے عنوان سے ہے۔

مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپا ہے۔ سنہ طباعت درج نہیں۔ اس میں مرزا کی دو تصویریں بھی شایع کی گئی ہیں ایک شروع میں، جو مروجہ تصویروں کی نقل ہے، دوسری بیچ میں جو کسی طرح مرزا کی تصویر سے مناسبت نہیں رکھتی سوائے مرزا کی ٹوپی کے جو بڑھاپے کی تصویروں سے پائی جاتی ہے۔

دستنبو — ٹھیٹھ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں "سونگھنے کا گلدستہ" یا "ترمیوہ جو سونگھا جائے"۔ مرزا نے اپنی کتاب کا یہ نام اس لئے رکھا کہ وہ اس کو ہندوستان اور انگلستان کے اعلیٰ حاکموں کے پاس بھیج کر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ میں ایک علمی ادبی آدمی ہوں مجھے باغیانہ خیالات اور حرکات سے کیا واسطہ۔ مرزا کی یہ ترکیب کارگر ہوئی اور انھوں نے اس کتاب کی ایک جلد گورنر جنرل بہادر کو اور ایک جلد ملکۂ معظمہ کی نذر کی اور اس کا خاطر خواہ فایدہ ہوا،

ملاحظہ ہوں خطوط مرزا بنام خواجہ غلام غوث بے خبر ۲ر دسمبر ۱۸۵۸ء لغایت ۲۶ر جنوری ۱۸۵۹ء دستنبو میں مرزا نے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر ۳۱ر جولائی ۱۸۵۸ء تک کی اپنی سرگزشت اور روداد لکھی ہے، اس میں غدر کے حالات بھی پائے جاتے ہیں اور ان مصائب کا بھی ذکر ہے جن سے غریب مرزا کو دوچار ہونا پڑا تھا۔

عنقائے معانی — اس کتاب کے نام کے نیچے پہلے صفحہ پر ذیل کی عبارت درج ہے۔ "بہترین وصحیح ترین وکمل شرح دیوان غالب اُردو، دیباچہ وتنقید دیگر شرح وکلام غالب وسوانح مرزا غالب از محقق اُردو زبان جناب شیر علی خاں معروف بہ مولانا سرخوش"۔ دوسرے صفحہ پر "دیوان غالب اُردو معہ ضمیمہ انتخاب نسخہ حمیدیہ لکھا ہوا ہے اور یہی ضمیمہ میرے سامنے ہے۔ جو انقلاب اسٹیم پریس لاہور میں چھپا ہے۔ سنہ طباعت درج نہیں۔ سرورق پر مرزا کے بوڑھاپے کی تصویر ہے جو عام طور پر شایع ہوتی رہتی ہے۔

دیوان غالب معہ شرح — از جوشؔ ملسیانی۔ بار اول۔ مطبوعہ مرکنٹائل پریس۔ جی۔ بی روڈ۔ دہلی ۱۹۵۰ء لبھورام جوشؔ پنجاب کے کہنہ مشق شاعر ہیں اور شعر فہمی کی اچھی قوت رکھتے ہیں۔ غالب کے دیوان کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، ہر شرح نگار نے اپنی شرح نگاری کی کوئی نہ کوئی خاص وجہ ضرور بتائی ہے۔ جوشؔ صاحب اپنی شرح نگاری کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ بی۔ اے کے طالب علموں کی ضروریات کو کسی نے بھی مدنظر نہیں رکھا۔ اس لئے یہ شرح معہ تبصرہ لکھی گئی ہے تاکہ طلبہ کو کلام غالب کے سمجھنے کا صحیح ذوق حاصل ہو جائے اور وہ کلام کی خصوصیات کو بھی ذہن نشین کر سکیں۔

تبصرے کے علاوہ بیس عنوانوں کے تحت کافی غور وفکر کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے اُن میں غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ خاں کے موازنے بھی شامل ہیں۔ تبصرے میں جناب جوشؔ نے مولانا حالیؔ کی رائیوں کو زیادہ معتبر مانا ہے۔ لیکن بعض اشعار غالبؔ کے بالکل غلط نقل کر کے ویسی ہی غلط شرح کی گئی ہے۔

آثار الصنادید — سرسید کی تصنیف ہے۔ جس کا پہلا اڈیشن ۱۸۴۷ء میں شایع ہوا تھا۔ اس میں کئی باب ہیں۔ چوتھے باب میں دہلی کے مشاہیر کا تذکرہ ہے۔ ان میں شعرا بھی ہیں۔ شعرا میں پہلا تذکرہ انتخاب کلام کے ساتھ مرزا غالبؔ کا ہے، یہ تذکرہ "آثار" کے دوسرے اڈیشن میں نہیں ہے۔

لطایف غالب — ۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی نے شایع کیا ہے۔ مرتب مسٹر ایم۔ اے شاہ ہیں۔

مرزا کی خوش مزاجی اور شوخی بیان سے لطف اُٹھانے کے لئے اس میں کافی مسالے ہیں۔

نئے اور پُرانے چراغ — آلِ احمد سرورؔ کے چند تنقیدی مضامین کے مجموعے کا نام ہے۔ جو دسمبر ۱۹۴۶ء میں پہلی بار آگرہ اخبار برقی پریس آگرہ میں چھپا ہے۔ اس میں "غالب" کے عنوان سے کئی صفحوں کا ایک مضمون ہے جو تنقیدی لغزشوں سے پاک نہ ہونے پر بھی سرور صاحب کے "مطالعۂ غالب" کی اچھی مثال ہے۔

مرثیۂ غالب — مولانا حالیؔ کی تصنیف ہے۔ جس کو ۱۹۱۵ء میں مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی نے اپنے

نظامی پریس میں چھپا ہے۔

غالب کے سو شعر۔ محمود علی خاں صاحب نے انتخاب کئے ہیں اور مکتبہ جامعہ دہلی نے شایع کیا ہے۔ شروع میں "اسد اللہ خاں غالب" کے عنوان سے مرزا کی سوانح حیات پر اشارے ہیں اور "فلسفۂ غالب" و سہل ممتنع کے عنوانوں سے شعروں کا انتخاب ہے۔ سرورق مروجہ تصویر بھی ہے۔

تذکرۂ طور کلیم ۔ اُردو شعرا کا اُن کے کلام کے انتخاب کے ساتھ فارسی زبان میں مختصر تذکرہ ہے۔ جو شاہ جہاں بیگم والیہ ریاست بھوپال کے عہد زریں میں لکھا گیا ہے اور مطبع مفید عام آگرہ ۱۲۹۷ھ میں چھپا ہے۔ صاحب تذکرہ ابوالخیر سید نورالحسن امیر الملک نواب محمد صدیق حسن خاں صاحب کے بڑے لڑکے ہیں۔ غالب کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"در پارسی پایہ اش از فحول اساتذہ کم نیست و در ریختہ ہم رتبہ اش بسیار اگر کسے است۔ اگر حدیقۂ نظم رانو بہار است، در عرصۂ نثر مرد کار است ——!"

اُردو دیوان سے ۴۳ شعروں کا انتخاب بھی درج ہے۔

خیر بہوروی

اپنے ذوق کی کوئی کتاب پسند کر لیجئے

تنقیدی مضامین۔ (اثر لکھنوی)۔۔۔ دو روپیہ
اخبار الاندلس۔ (خلیل الرحمان) تین حصے پندرہ روپیہ
اُردوئے قدیم۔ (شمس اللہ قادری) ایکروپیہ آٹھ آنہ
اساس التعلیم۔ (مولوی عبدالحق)۔ تین روپیہ
اسلامی خلافت (محمد موسیٰ خاں شروانی) ڈھائی روپیہ
اسلامی زندگی (ظہور احمد وحشی) ایک روپیہ چار آنہ
افادۃ الاسلام ۲ حصے (انوار اللہ شاہ) رد قادیانیت ۵
امیر اللغات ۲ حصے (نایاب) پندرہ روپیہ
خطبات احمدیہ (سر سید مرحوم) پانچ روپیہ
تاریخ امریکہ (تنہا)۔۔۔ دو روپیہ آٹھ آنہ

تاریخ ڈھاکہ (طیش)۔۔۔ تین روپیہ
تذکرۂ کاملان رامپور (شوق) پانچ روپیہ
تذکرۂ خندۂ گل (آسی)۔۔۔۔ چار روپیہ
چھان بین (تنقیدی مضامین) اثر لکھنوی تین روپیہ آٹھ آنہ
حقایق اسلام (انوار الحق) دو روپیہ آٹھ آنہ
حیات مصطفےٰ کامل پاشا۔۔۔۔ دو روپیہ
حیات محمد علی جناح (رئیس احمد جعفری) آٹھ روپیہ
داستان زوال (تاریخ بنی اسرائیل) امیر احمد علوی ۴
دلائل الخلافت (ردّ شیعہ)۔۔ تین روپیہ
اُردو کی عشقیہ شاعری (فراق) دو روپیہ بارہ آنہ

ازواج الانبیاء (محوی صدیقی) دو روپیہ چار آنہ
اصنام خیالی (افسانے) جلیل قدوائی دو روپیہ آٹھ آنہ
انتخاب سودا۔۔۔۔۔ ایک روپیہ آٹھ آنے
فن باغبانی دو جلد۔۔۔ پانچ روپیہ آٹھ آنے
باقیات فانی (کلیات فانی بدایونی)۔۔ تین روپے
تاریخ مغربی یوروپ (یکجائی تنہا) تین روپیہ آٹھ آنہ
تاریخ شاہان اسلام (شوق امرتسری) ایکروپیہ آٹھ آنہ
تذکرہ ہند مصور (سید علی بلگرامی) نایاب۔ فوٹو روپیہ (لغت)
جوہر فلک (ناول) انعام اللہ خاں۔ بارہ روپیہ (لغت)
چراغ سخن (عروض) یگانہ۔ ایک روپیہ آٹھ آنہ

منیجر نگار۔ لکھنؤ

کوئی کمیشن نہیں ملے گا ۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار۔

سامی زبانیں اور ان کا رسم خط

قوموں اور ملکوں کی کہانیوں میں زبان اور رسم الخط کا مسئلہ بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اقوام عالم کی ترقی و تنزل کے ساتھ زبان اور رسم الخط کو بھی عروج و زوال سے سابقہ رہا، ہندوستان میں آج جو کشاکش زبان اور رسم الخط کے لئے ہو رہی ہے، وہ اس سے پہلے بھی دنیا کی قوموں میں ہو چکی ہے، دنیا میں جس قدر کسی قوم کو عروج ہوا اس کی زبان اور رسم الخط میں بھی اسی لحاظ سے ترقی ہوتی گئی اور جب اس قوم پر زوال آنے لگا تو رفتہ رفتہ اسکی زبان بھی انحطاط پذیر ہونے لگی یہاں تک کہ ایک خاص دایرہ میں محدود ہو کر وہ مردہ ہو گئی اور پھر اس کا انجام یہ ہوا کہ نہ کسی گوش شنوا نے اس کو سُنا اور نہ کوئی صفحہ اس کے حروف و رسوم سے اثر پذیر ہو سکا، ہاں آثار قدیمہ کے طور پر کہیں پتھر اور اینٹ کے ٹکڑوں، درخت کی پتیوں، جانور کے چرسوں، قبر کی الواح، اور ویران عمارات کی بوسیدہ دیواروں پر ہم اس کی نشانیاں پاتے ہیں اور بے اختیار ہمیں ایک دل والے عربی شاعر کا یہ عبرت انگیز شعر یاد آجاتا ہے:-

"تلک آثارنا تدل علینا فانظروا بعدنا الی الآثار"

آج ہمارے سامنے اُردو زبان اور رسم الخط کا مسئلہ ہے، اور ہم اسی نقطۂ نظر سے سامی زبانوں اور انکے رسوم خط کی ایک مختصر سی کہانی آپ کے سامنے پیش کریں گے، اُردو رسم الخط سامی رسم الخط ہے، اور اس میں شک نہیں زبان کے لحاظ سے اُردو مسلمانوں کی تہذیب سے کوئی خصوصیت نہیں رکھتی، کیونکہ آج صفحۂ ارض کے کسی غیر ہندی مسلمان کی یہ مادری زبان نہیں، یہ ہندوستان میں پیدا ہوئی، بڑھی اور پروان چڑھی، یہ ہندوستانی قوموں کے میل جول کی ایک نہ مٹنے والی یادگار ہے، مگر سامی رسم الخط مسلمانوں کا خاص تہذیبی ورثہ ہے اور اس حیثیت سے اب اس کی زندگی و موت کا ضامن خود ہندوستانی مسلمان ہے اگر اپنے اندر جینے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ اپنے رسم الخط کو بھی زندہ رکھیگا، ورنہ جو قوم مردہ ہو جاتی ہے، اس کی زبان کا رسم الخط بھی فنا ہو جاتا ہے، ہاں کبھی کبھی تاریخ نے ایسے نقوش بھی پیش کئے ہیں کہ کسی قوم کی زبان اور اس کا رسم الخط سیاسی زندگی کے زوال کے بعد بھی ہزاروں برس تک زندہ رہا۔

شومری زبان عراق قدیم سامی قوموں کا گہوارہ رہا ہے یہاں تین ہزار برس قبل مسیح میں بابل و آشور کے طنطنۂ فرمانروائی سے پہلے "شومری تمدن" پھیلا ہوا تھا، اور اس قوم کے فرمانروا "ملوک شومر و اکاد" کے

نام سے مشہور تھے، ان کی تہذیب، ان کے مذہبی ہیاکل، ان کی زبان اور ان کا رسم الخط بہت دیر پا اور اثر انداز ثابت ہوا، بابل کے بادشاہ سرجون اول نے جب شومری امرا سے لڑکر ایک عظیم الشان مملکت کی بنیاد ڈالی اور ان کی فرمانروائی کا دایرہ جزیرۃ العرب، سوریہ، فلسطین اور بحر ابیض متوسط سے گزر کر جزایر یونان تک محیط ہوگیا تو شومری قوم کی تہذیب جنوبی عراق میں پھیلی ہوئی تھی اور جب یہ قوم مفتوح ہوگئی اور بابلی بادشاہ (سرجونِ اول) نے اس کا سیاسی اقتدار ختم کر دیا تو بھی ایک زمانہ تک شومریوں کی زبان اور ان کا رسم الخط جس کو "مسماری" رسم الخط کہا جاتا ہے، نہ صرف بابلی و آشوری شہنشاہوں کے زمانہ میں متداول رہا، بلکہ دنیا کی اور قوموں نے بھی یہی رسم الخط اختیار کیا اور تین ہزار برس تک یہ رسم الخط شومری قوم کے زوال کے بعد بھی دنیا میں رائج رہا، بابلی قوم کو جب عروج ہوا، ان کا دائرۂ اثر و نفوذ عظیم الشان اور وسیع ہوتا گیا تو انھوں نے محسوس کیا کہ ان کو اپنی زبان کو فروغ دینا اور پڑوسی قوموں اور حکومتوں سے اسی زبان میں رسل و رسایل اور ربط و اتصال پیدا کرنا چاہئے ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون لکھتا ہے، کہ "یہ خیال ہر اس قوم کو پیدا ہوتا ہے جو سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی زندگی میں عروج حاصل کرتی ہے۔ (کما ہو شان الامم التی تتقدم فی معارج الرقی وتتعاظم شؤونہا السیاسیۃ والاقتصادیۃ والاجتماعیۃ) ملوک بابل نے شومری زبان ترک کردی اور اپنی بابلی زبان کو قومی زبان قرار دیا، لیکن وہ مسماری رسم الخط سے بے نیاز نہ ہو سکے، انھوں نے بابلی زبان کو شومریوں کے مسماری خط میں رواج دیا، اسی کے ساتھ ان کے یہاں یہ وسعتِ نظر بھی پائی جاتی ہے کہ انھوں نے شومری زبان کو مٹایا نہیں، بلکہ لوگوں کو اس کے استعمال میں آزاد چھوڑ دیا۔

مسماری رسم الخط نہ تو ہیروغلیفی رسم الخط کی طرح تصاویر پر مبنی ہوتا تھا، اور نہ کنعانی رسم الخط کی طرح حروف پر، بلکہ اس کا ایک خاص نظام تھا، جس کی بنیاد نہ خالص صوری تھی نہ خالص حرفی، دنیا کی مختلف قوموں اور ملکوں نے اسی رسم الخط کو اختیار کر لیا، چنانچہ عیلم، فارس، آرمینیا، فلسطین میں بھی اس کا رواج تھا، یہاں تک کہ مصر کا بادشاہ امون حوطف چہارم؛ امرائے فلسطین سے اسی رسم الخط میں خط و کتابت کرتا تھا اس خط کو اس قدر عروج ہوا کہ اس سے قبل دنیا کے کسی رسم الخط کو نہ تھا، اور بعد میں بھی لاطینی اور عربی رسوم خط کے علاوہ کسی رسم الخط کو اس کے مقابلہ میں رواج و قبول حاصل نہ ہو سکا، مسماری رسم الخط برخلاف اکثر سامی رسوم خط کے بائیں جانب سے لکھا جاتا ہے اس کو فرانسیسی اصطلاح میں "اسفینی" اور عبرانی محاورہ میں خط الاوتاد (میخی) کہا جاتا ہے، عربی زبان میں اسکو "مسماری خط" کہتے ہیں، لیکن فرانسیسی اور عبرانی اصطلاحیں، خط کی صوری حالت کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور قریب ہیں۔

بابلی و آشوری زبان

قوموں کی حیات و موت کی طرح زبان کی بقا و فنا، ترقی و زوال کی بھی مبسوط تاریخ ہے سامی قوموں میں قدیم ترین بابل و آشور کی قومیں ہیں، ان کے تمدن و تہذیب،

حکومت و سیاسی اقتدار کی کہانیاں بڑی اہم، اثر آفریں اور سبق آموز ہیں، "بابل" دراصل "باب ایل (باب اللہ) تھا، یہ عراق کا مشہور قدیم ترین شہر ہے، جس کو دو ہزار آٹھ سو برس (قبل مسیح) سامی بادشاہ سرجون اول نے بنایا تھا، جغرافی اعتبار سے عراق دو حصوں میں بٹا ہوا تھا، شمالی نجدی علاقہ اور جنوبی تہامی علاقہ، جنوبی علاقہ بہت قدیم زمانہ سے شومری قوم کا مسکن تھا لیکن یہ پتہ نہیں کہ اس قوم کا پہلا وطن کہاں تھا اور کب ہجرت کر کے یہ یہاں آئی۔ شومریوں نے تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بڑی ترقی کی تھی، یہاں تک کہ سامی قومیں جزیرۃ العرب یا سوریہ سے آئیں اور ان پر غلبہ حاصل کر لیا، پھر بھی وہ شومری تمدن سے خود مغلوب ہو گئے اور انھیں کی زبان اور رسم الخط انھوں نے اختیار کر لیا، شمالی علاقہ میں آشوری قوم آباد تھی، اس کو بابلیوں کے ساتھ قرابت تھی، لیکن اس میں سامی خصوصیت زیادہ پائی جاتی تھی، بابل پر کنعانی اور کاسانی اقتدار ہوتا رہا ایک زمانہ تک آشوری قوم بابل کی باج گزار اور مطیع رہی، رفتہ رفتہ خود اس میں بیداری پیدا ہوئی، ایک ہزار برس تک بابل و آشور میں پیاپے لڑائیاں ہوتی رہیں، یہاں تک کہ ۱۳۰۰ ق۔م میں شلمنأسر اول کے عہد میں آشوریوں نے ایک شاندار اور مستحکم حکومت قائم کر لی، "آشور" دراصل اس چھوٹے سے علاقہ کا نام ہے، جو نہر راب صغیر اور کبیر سے گھرا ہوا ہے، اور ایک قصبہ کا بھی نام ہے اسی علاقہ میں آشور کا پایۂ تخت تھا، جب شلمنأسر بادشاہ ہوا تو اس نے ۱۲۹۰ ق۔م میں حکومت کا پایۂ تخت کالاح میں منتقل کر دیا، جب سرجون آشوری کا زمانہ آیا تو اس نے نینوا کو حکومت کا مرکز بنایا اسوقت نینوا کو بڑی شہرت اور عظمت حاصل ہوئی، آشوریوں کی حقیقی عظمت کا زمانہ نویں صدی ق۔م میں ہوا جبکہ نصیر بال آشوری تخت پر بیٹھا، اس نے فارس، آرمینیا اور ایشیائے کوچک میں لڑائیاں کیں اور فتوحات حاصل کئے اس کے بیٹے شلمنأسر ثانی کے زمانہ میں پہلی مرتبہ بنی اسرائیل سے مقابلہ ہوا، اور پھر باغی گروہ "پول" کے زمانہ (۷۴۵ ق۔م۔ ۷۲۸ ق۔م) میں بابل، آشور کے زیر حکومت آگیا، اسی طرح سوریہ کی آرامی قوم اور فلسطین کی اسرائیلی سلطنت نے بھی آشوریوں کے سامنے سر جھکا دیا، اور جزیہ دیتی رہی، سرجون آشوری (۷۲۱ ق۔م۔ ۷۰۵ ق۔م) نے پہلی مرتبہ اپنا لقب "بادشاہ آشور و بابل" قرار دیا اس سے قبل آشوری بادشاہوں نے یہ لقب کبھی اختیار نہیں کیا تھا، سرجون کے بیٹے آشور حادون نے اپنا لقب "بادشاہ آشور، بابل و مصر" قرار دیا، چونکہ اس نے مصر پر حملہ کر کے فرعون کو نواحی سوڈان میں بھگا دیا تھا، یہ پہلا آشوری بادشاہ تھا جس نے مصر میں قدم رکھا اس کا بیٹا آشور بانیبال عیش و عشرت اور شعر و ادب کا دلدادہ تھا۔ یکایک حکومت میں ضعف آگیا، اور پڑوس کی طاقتیں ابھر آئیں، اس وقت بابل پر کلدانی قوم کی حکومت تھی، اس کا بادشاہ "نابوپلاسر" بڑا جری تھا اس نے بابل اور عیلم سے ایک جرار فوج جمع کی، اور آشوری مملکت پر حملہ کر دیا، اور ۶۰۷ ق۔م میں نینوا کا ایک عرصہ تک محاصرہ کر کے اس کو فتح کر لیا، پھر ایک بار بابل کا ستارۂ اقبال چمکا اور بخت نصر ثانی کے عہد میں اس کو عظیم الشان ترقی ہوئی، بڑی بڑی قوموں نے حکومت بابل کی اطاعت قبول کی، بخت نصر ثانی کا تذکرہ یہودیوں

کے یہاں ملتا ہے، "گرچہ ہے کس کس خرابی سے" کیونکہ اس نے شہر اور وشلیم (بیت المقدس) کو ویران کر ڈالا، اور ہیکل مقدس کو توڑ پھوڑ دیا تھا، یہ ۵۸۶ء ق۔م کا واقعہ ہے۔

آپ نے بابل و آشور کی عظمت و ترقی کی مختصر سی کہانی سنی، مستشرقین نے عراق میں کھدائی اور اکتشاف کا کام شروع کیا تو وہ یہاں کے آثار قدیمہ کی بنا پر یہاں کی زبان کو آشوری زبان کہنے لگے چونکہ یہ آثار آشوریوں کی مملکت نینوا کے اطراف میں دستیاب ہوئے تھے، یہ تحریریں مسماری رسم الخط میں تھیں بعد میں مستشرقین عراق کی ان قدیم زبانوں کو "بابلی آشوری زبان" سے تعبیر کرنے لگے، بابلی آشوری زبان اور ان کے تمدن و تہذیب کی ساری تحریریں شومریوں کے مسماری رسم الخط میں ہیں۔

کنعانی زبان

سامی قوموں میں کنعانیوں کا بھی اہم مقام ہے، ان کی زبان اور ان کی حکومت کو ایک عرصہ تک بڑا فروغ رہا، قدیم تہذیبوں پر کنعانی اثر نمایاں نظر آتا ہے، کنعانیوں کی نوآبادیاں دور دور پھیلی ہوئی تھیں، چنانچہ مشہور کنعانی بادشاہ "کلمو" کی تحریریں جو نویں صدی قبل مسیح سے متعلق ہیں جزیرۂ قبرص میں پائی جاتی ہیں، یہ ظروف گلی پر کنعانی خط میں لکھی ہوئی ہیں، اسی طرح کنعانی عہد کے نقوش، مصر، صقلیہ، بلاد یونان، مالطہ، سردینیا جنوبی فرانس، جنوبی ہسپانیہ اور قرطاجنہ (قرت حدش) میں پائے جاتے ہیں، کنعانی اور عبرانی زبانوں میں ایک قریبی مشابہت ہے، خواہ کنعانی زبان اپنے وطن میں پائی جائے یا اپنی نوآبادیوں میں، کنعانیوں اور بنی اسرائیل میں قرابت قریبہ تھی، علمانے کنعانی رسوم خط کے تین دور قرار دئے ہیں، قدیم، متاخر اور عہد قرت حدش، ..... قرت حدش (قرطاجنہ) شمالی افریقیہ میں کنعانی نوآبادی تھی، رومیوں اور قرت حدش سے بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں جو سامی جنگوں کی تاریخ میں بڑی عظیم الشان تاریخی لڑائیاں سمجھی جاتی ہیں، اہل رومہ اور قرطاجنہ کی لڑائیاں آریائی اور سامی عناصر کی کشاکش کا نتیجہ تھیں، جس میں افریقیہ کی سرزمین کے اندر سامی عنصر کو شکست ہوئی پھر مسلمانوں کے جھنڈے کے نیچے دوبارہ سامیوں کو فتح و نصرت حاصل ہوگئی۔

عبرانی زبان

کنعانیوں کے بعد عبری قوم کی حکومت، تہذیب اور تمدن کا دور، عروج آتا ہے، عبری قوم کو کنعانیوں سے نسلی علاقہ تھا، عبری رسم الخط بھی کنعانی رسم الخط سے مستفاد ہے، عبری کی وجہ تسمیہ میں اختلافات ہیں بعض مستشرقین نے قدیم یہودی علماء کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابراہیم نے نہر کو عبور کیا تھا اس لئے وہ عبری کہلانے لگے، مگر یہ نہیں معلوم کہ نہر اردن کو انھوں نے عبور کیا تھا یا نہر فرات کو، کیونکہ توریت میں ہر بڑی نہر کو بلا اصل نام کی طرف منسوب کئے ہوئے صرف 'نہر' کہا گیا ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ ابراہیمؑ کا یہ لقب اس لئے ہوا کہ انکے قدیم آباد اجداد میں ایک کا نام "عبر" تھا، لیکن عبری کی وجہ تسمیہ نہ تو کوئی خاص تاریخی واقعہ ہے، نہ کوئی شخصیت، بلکہ بنی اسرائیل دراصل بدوی صحراوی قوم تھے، اور وہ ایک جگہ مقام کرنے کی بجائے پانی اور چارہ کی تلاش میں ایک جگہ

سے دوسری جگہ کوچ کیا کرتے تھے، اس لئے "عبری" لفظ بدوی کے مثل ہے، جس کے معنی ہیں میدان اور جنگل کا رہنے والا کنعانی، مصری اور فلسطینی قومیں بنی اسرائیل کو ان کے غیر متمدن ہونے اور ان کی صحراوی سکونت کے باعث "عبری" کہتی تھیں جب بنی اسرائیل کنعان میں آباد ہو گئے اور تہذیب و تمدن سے واقف ہوئے تو وہ لفظ "عبری" سے نفرت کرنے لگے کیونکہ اس سے ان کی ابتدائی صحراوی اور غیر متمدن زندگی کی یاد تازہ ہوتی تھی، اس لئے اب انھوں نے بنی اسرائیل کہلانا پسند کیا۔

نقش سلوان جو بیت المقدس کے قرب میں ۱۸۸۰ء میں دستیاب ہوا، قدیم عبری خط میں ہے جو کنعانی رسم الخط سے ملتا جلتا ہے، "یہ عبری خط" کہلاتا تھا، پھر اس کو یہودیوں نے بدل ڈالا اور ایک خط مربع یا خط آشوری ایجاد کیا جو آرامی خط سے مشابہت رکھتا ہے اور جو آج تک ان کے یہاں استعمال میں ہے۔

آرامی زبان

سامی قوموں اور زبانوں میں آرامی قوم اور ان کی زبان و رسوم خط کو بھی تاریخی اہمیت حاصل ہے، پندرھویں صدی ق۔م میں آرامی قوم جزیرۃ العرب سے سوریہ میں آئی لیکن جزیرۃ العرب میں کہاں اس کی سکونت تھی اس کا تعین نہیں ہو سکتا، مستشرقین نے آرامی زبان کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، پوربی آرامی اور پچھمی آرامی، اول الذکر عراق کے جنوبی اور شمالی شہروں کی زبانوں پر مشتمل ہے، دوسری سوریہ، فلسطین اور طور سینا، کی زبانوں پر، آرامی رسوم خط قدیم کنعانی رسم خط سے منقول ہیں بعض اصل کنعانی خط سے قریب ہیں اور بعض میں ظاہری تغیر ہوا ہے، آرامی رسم خط تین حصوں میں بنا ہوا ہے، قدیم تدمری اور نبطی۔

قبایل تدمر اور اس کے ارد گرد قدیم زمانہ سے آرامی زبان کا رواج تھا، تدمر قوم کو ایک عرصہ دراز تک اثر و اقتدار رہا ہے، یہ قوم صحرائی اور زرخیز علاقوں میں واسطہ کی حیثیت رہی ہے، اس کے بازار قدیم زمانہ میں بڑی شہرت رکھتے تھے، اس طور سے یہ ہندوستان، ایران، عراق، سوریہ، فلسطین، مصر اور یورپ کے تاجروں کا قبلہ بنا ہوا تھا اور رومی سلطنت جس کے زور و توانائی کے سامنے اکثر قوموں نے نیایش و اطاعت سے کام لیا، قبایل تدمر کے پاس تحفے اور سرکاری وفود بھیجا کرتی تھی۔

تدمری

قبایل تدمر کی جمہوری حکومت تھی، جس کا نظام یونانی جمہوریتوں سے ملتا جلتا تھا، تدمری تحریروں میں قدیم ترین تحریر پہلی صدی ق۔م سے متعلق ہے اور آخری تحریر تیسری صدی بعد مسیح سے تدمری نقوش افریقہ، روما، بلاد المجر اور انجلترا (انگلستان) میں پائے جاتے ہیں، چونکہ تدمری قبایل کی بڑی بڑی جماعتیں رومی فوج میں ملازم تھیں، تدمری خط عبری مربع رسم الخط سے ملتا جلتا ہے۔

نبطی

دولت نبطیہ جزیرۂ طور سینا میں ظاہر ہوئی اور یہاں سے شام کے صحرا تک پھیل گئی اور ایک طرف سے دمشق اور اطراف نہر فرات پر مشتمل ہوئی اور دوسری طرف سے بلاد حجاز پر، مستشرقین نے طور سینا میں بسنے سے قبل نبطیوں کے اصل وطن کا پتہ لگانے کی بڑی کوشش کی، لیکن نبطی کون تھے؟ مختلف اسباب کی بنا پر مستشرقین کا

خیال ہے کہ یہ خالص آرامی قوم نہ تھی، مملکت نبط کو طور سینار میں پیتر العربیہ کے نام سے پکارا جاتا تھا، نبطی نقوش سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عربی زبان کے کثیر الفاظ پر مشتمل ہے، اور یہ تمدنی لحاظ سے وثنی تھے، ان کے اعلام (خاص نام) عربی زبان سے خاص مشابہت رکھتے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں کے ساتھ محض ہمسایگی کا یہ اثر نہیں بلکہ یہ نتیجہ ہے نسلی اختلاط کا، اسی لئے بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ نبطی عرب قوم کے لوگ ہیں جو نقوش اور تمام عمرانی چیزوں میں آرامی رسم خط استعمال کرتے تھے، علاقہ شرق اردن کے مقام "ام الجمال" اور علاقہ حوران کے مقام "سلخد" میں جو کتبات ملے ہیں انسے پتہ چلتا ہے کہ نبطی خط عربی کوفی خط سے ملتا جلتا ہے۔

سریانی زبان

پوربی آرامی زبان سریانی زبان سے مشہور ہے اور اس کا مرکز "اُدوسا" تھا جو حران سے آٹھ گھنٹے کی دوری پر ہے "ادوسا" کا نام سریانی میں "اُدھی" ہے، یونانیوں نے اس کا نام "ادسا" رکھدیا عرب اس کو "الرہاء" کہنے لگے، پھر پندرھویں صدی میں اس کا نام "ادرفا" ہوگیا جو آج تک قایم ہے، رومی لشکروں نے پہلی صدی ق۔م میں مشہور جنرل بومبیوس کے تحت جب شام پر چڑھائی کی اور آل سولیقوس کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تو شام اور عراق میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں عالم وجود میں آئیں اور ان میں اکثر آرامی عنصر کے تابع تھیں ان حکومتوں میں ایک ریاست جو اسرونیا کے نام سے موسوم ہوئی اور اس کا مرکز شہر ادسا تھا بہت زیادہ مشہور ہوئی اور اس نے بقیہ تمام آرامی شہروں پر فوقیت حاصل کرلی، اسوقت یہاں مسیحیت پھیل چکی تھی۔

سریانی گروہ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا ایک وہ جو رومیوں کے تحت تھا، اور دوسرا بلاد فارس میں پایا جاتا تھا۔ رومی یا غربی گروہ الیعاقبہ (یعقوبیوں) کے نام سے مشہور ہوا اور دوسرا گروہ النساطرہ (نسطوریوں) کے نام سے۔

سریانی رسم الخط کی تین قسمیں ہیں، قدیم ترین "الاسترنجلو" ہے جس سے خط نسطوری اور خط "السرتو" مشتق ہے، خط نسطوری کو ہندوستان میں خط کلدانی اور سرتو کو یہاں "قلم مردنی" اور یورپ میں "خط یعقوبی" کہا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آرامی خطوط کنعانی خط سے مستفاد ہیں آرامی قوم نے یہ اس وقت اختیار کیا، جبکہ وہ غیر متمدن تھی، پھر انھوں نے اس میں تھوڑا سا تصرف کیا، یہاں تک کہ آرامی رسم الخط کو ایسا تفوق حاصل ہوا، کہ دنیا کی کثیر قوموں نے اپنی تحریروں میں اسی کو اختیار کیا، ضرورت اور صورت حال کے لحاظ سے بعض قوموں نے خط سریانی اختیار کیا، جیسا کہ دولت ساسانیہ میں اہل فارس نے کیا، پھر یہ خط ایشیا کے داخلی میں ممالک مغول سے نکل کر چین تک پھیل گیا اور خط سریانی کے لئے یہ فخر کافی ہے کہ اس نے تدمری اور نبطی رسوم خط کے ذریعہ تمام عربی خطوط پر گہرا اثر ڈالا۔

(باقی)

عبدالمالک آروی

اقبال کے خطوط عطیہ فیضی کے نام

عطیہ بیگم فیضی نے اُن خطوط کا مجموعہ شایع کر دیا ہے جو اُسے علامہ اقبال نے کسی زمانہ میں لکھے تھے ان خطوط میں نہ صرف اقبال کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی شخصیت نظر آتی ہے۔ بلکہ اُس علمی و ادبی اور معاشری ماحول کے خدوخال بھی نمایاں ہوتے ہیں جس میں علامہ اقبال نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصّہ بسر کیا۔

عطیہ بیگم فیضی ایران کے ایک مشہور خاندان کی چشم و چراغ ہے جس نے بمبئی میں آکر مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی اُسے سوشل حلقوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی ہے وہ نہ صرف بمبئی بلکہ کیمبرج کے علمی ادبی حلقوں میں بھی ہر دلعزیز ہے جن دنوں علامہ اقبال کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے عطیہ فیضی بھی تکمیل تعلیم کے سلسلہ میں لندن میں فروکش تھی اُس کی علمیت و فضیلت اور ہر دلعزیزی کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ اقبال سے پہلے مولانا شبلی مرحوم بھی اُسکے گرویدہ رہے ہیں علامہ اقبال ہمیشہ اُسے اپنا خیر خواہ اور دوست تصور کرتے رہے ہیں۔ اُنھوں نے ابتدائی دور میں اُسے بے شمار خطوط لکھے اور نقد و تبصرہ کے لئے اپنا تازہ کلام بھی بھجوایا عطیہ فیضی بھی ان کو ہمیشہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتی رہی ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر اُن کو مفید مشوروں سے سرفراز کیا ہے۔ اُردو۔ ادب عطیہ فیضی کا یہ احسان بھی فراموش نہیں کر سکتا کہ اُس نے علامہ مرحوم کے پرائیویٹ خطوط کتابی صورت میں شایع کر دئے۔ ان خطوط سے علامہ مرحوم کی زندگی کے بہت سے گوشے بے نقاب اور کئی نفسیاتی اُلجھاؤ دور ہو جاتے ہیں۔

پہلی ملاقات

علامہ اقبال سے عطیہ بیگم فیضی کی پہلی ملاقات یورپ میں ہوئی۔ لیکن کس انداز سے ہوئی اس کا جواب عطیہ فیضی ہی کی زبانِ قلم سے سنئے:۔

"یکم اپریل ۱۹۰۶ء کی تقریب منانے کے لئے مس بیک نے مجھے ایک "خصوصی دعوت نامہ" ارسال کیا جس میں لکھا کہ میں ایک ہونہار نوجوان محمد اقبال سے ملوں جو خاص طور پر کیمبرج سے میری ملاقات ہی کے لئے آرہا ہے۔ یہ "دعوت نامہ" دیکھ کر میں حیران رہ گئی کیونکہ اس سے پہلے میں نے اقبال کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔ اس کے علاوہ اس قسم کے دعوت نامے میرے پاس اکثر آتے رہتے تھے۔ لہذا میرے دل میں کوئی خاص اشتیاق پیدا نہ ہوا، تاہم مس بیک کا حکم ماننا ضروری تھا وہ لندن میں ہندوستانی طلبا کی راحت و آسایش کے لئے کوشاں رہتی اور اُن سے ہمیشہ مادرانہ شفقت کے ساتھ پیش آتی تھی۔ یکم اپریل کو کھانے کی میز پر میں نے دیکھا کہ محمد اقبال عربی، فارسی اور سنسکرت کے فاضل ہیں میں نے محسوس کیا کہ وہ

بڑے حاضر جواب ہیں اور کسی کے کمزور پہلو سے فایدہ اُٹھانے کے لئے ہر وقت طیار رہتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کا مذاق بھی اُڑانے سے نہیں چوکتے۔ مس بیک مجھ پر پہلے ہی واضح کر چکی تھی کہ اقبال مجھ سے خاص طور پر ملنا چاہتے ہیں، میں ذرا بے تکلف اور منہ پھٹ واقع ہوئی تھی۔ اس لئے میں نے پوچھا کہ آخر مجھ سے خاص طور پر ملنے کی کیا وجہ ہے؟ اقبال کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے یہ ظاہر نہ ہو سکا کہ وہ طنز کر رہے ہیں یا تعریف۔ اُنھوں نے جواب دیا۔ "آپ اپنی سفر کی ڈائری کے ذریعہ سے ہندوستان اور لندن میں بہت مشہور ہو چکی ہیں۔ اس لئے مجھے آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔" میں نے کہا "میں یہ ماننے کو طیار نہیں کہ آپ نے کیمبرج سے اتنی دور آنے کی زحمت محض میرے لئے گوارا کی ہو۔ مذاق برطرف۔ آپ یہ بتایئے کہ مجھ سے ملنے کی ضرورت آپ کو پیش کیوں آئی؟

اقبال میری صاف گوئی سے کچھ گھبرا سے گئے اور کہنے لگے:۔ "میں سید علی بلگرامی اور اُن کی بیگم کا دعوت نامہ لے کر آیا ہوں انھوں نے یہ کام میرے سپرد کیا ہے کہ آپ کو دعوت میں شریک ہونے کے لئے رضامند کروں۔ اگر آپ نے انکار کر دیا تو مجھے ناکامی کا طعنہ ملے گا۔ جو میں نے کبھی برداشت نہیں کیا۔ اگر آپ نے دعوت منظور فرمالی تو میزبانوں کی عزت افزائی ہوگی۔"

خط و کتابت پہلی ملاقات کے بعد تکلف اور تصنع کے حجابات دور ہوتے گئے اور بہت جلد دونوں کے درمیان دوستی اور اخلاص کے تعلقات استوار ہوتے گئے اس کے بعد علامہ اقبال خواہ کیمبرج میں رہے۔ یا لاہور اور سیالکوٹ میں۔ عطیہ فیضی لندن میں رہیں یا جنیرہ اور بمبئی میں خط و کتابت کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا۔ ان خطوط میں نجی واقعات ہی درج نہیں ہیں۔ علمی و ادبی بحث بھی چھیڑی گئی ہے۔ چند خطوط کا اُردو ترجمہ ملاحظہ فرمایئے:۔

(۱)۔ علامہ اقبال کو علی گڑھ یونیورسٹی میں فلسفہ کی "کرسی صدارت" پیش کی گئی تھی۔ لیکن آپ نے اس اعزاز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جب عطیہ فیضی نے اس کی وجہ دریافت کی۔ تو علامہ نے ۹ر اپریل ۱۹۰۹ء کو یہ خط لکھا:۔

لاہور ۔ ۹ر اپریل ۱۹۰۹ء ۔ مائی ڈیر مس فیضی ۔ آج ہی صبح مجھے آپ کا کرمنامہ ملا۔ جس کا شکریہ!

میں آپ کو کیا بتاؤں کہ مولانا میر محمد کون ہیں؟ غالباً آپ ان سے واقف نہیں ہیں۔ تاہم اُن کی اہلیہ آپ سے متعارف ہیں۔ امید ہے اب آپ پہچان سکیں گی۔

ہاں۔ میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فلسفہ کی کرسی صدارت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ چند روز پہلے مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں تاریخ کی کرسی صدارت بھی پیش کی گئی تھی لیکن میں نے قبول نہیں کی۔ دراصل میں ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ میں جلد سے جلد اس ملک سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھ پر اپنے بھائی کی طرف سے اخلاقی فرض عاید ہوتا ہے۔ جو مجھے باہر جانے سے روک رہا ہے۔ میری زندگی حد درجہ قابل رحم ہے۔ مجھ پر خواہ مخواہ بیوی ٹھونسی جا رہی ہے۔ حالانکہ میں نے والد صاحب کو لکھا تھا کہ میرے انکار کے باوجود آپ کو شادی کے انتظامات کرنے کا کیا حق ہے؟ میں اسے گزارا دینے کو طیار ہوں۔ لیکن اُسے پاس رکھ کر میں اپنی زندگی کو عذاب میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا

ایک انسان کی حیثیت سے میرا حق ہے کہ اپنی خوشی اور مسرت کا خیال رکھوں۔ لیکن قدرت یا سماج اُسے چھیننا چاہتی ہے۔ میں دونوں کا مقابلہ کر رہا ہوں۔ میرے سامنے اب ایک ہی رستہ ہے۔ اس بدبخت ملک کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلا جاؤں یا شراب میں پناہ لوں۔ تاکہ خودکشی میں آسانی ہو۔ مجھے ان خشک کتابوں کے ویران صفحات سے مسرت نہیں مل سکتی۔ میری روح میں ایک شعلہ جوالہ بھڑک رہا ہے۔ جو ان کتابوں اور سماجی بندھنوں کو پھونک دینے پر قادر ہے۔ مجھے ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں روح کو اپنے جسم سے اُتار پھینکنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے انتہائی بے تکلفی سے اپنے جذبات کا اظہار کر دیا ہے۔

میرے خیال میں اب آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ میں نے ملازمت قبول کرنے سے کیوں انکار کیا ہے؟

مجھے افسوس ہے کہ آپ کے لئے آستانی نہیں مل سکی۔ انجمن کے سیکرٹری نے مجھ سے کہا ہے کہ آستانی ڈھونڈنا ممکن نہیں ہے چند دن ہوئے میں نے ایک عام جلسے میں "حقیقتِ مذہب" پر تقریر کی۔ اور بتایا کہ معاشرے کے ارتقاء میں اُسے کیا قوت حاصل ہے؟ میں نے سرسری نوٹ تیار کر رکھے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے پوری تقریر نوٹ کی ہے یا نہیں۔ انجمن میں میرے لیکچر کا موضوع یہ ہوگا ــــ "اسلام ایک سیاسی اور اخلاقی نصب العین کی حیثیت سے"۔ اگر ممکن ہو سکا تو ایک نقل آپ کو بھی بھجوا دوں گا۔ میں "آبزرور" کے اڈیٹر سے کہوں گا۔ کہ ایک پرچہ آپ کو بھی بھیج دے۔

عبدالقادر لاہور آگئے ہیں اور چیف کورٹ میں پریکٹس کر رہے ہیں۔

مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا۔ کہ آپ یہ ماننے کو طیار نہیں کہ میں آپ سے اور ہز ہائی نس اور بیگم حمیدہ سے ملنے کے لئے بمبئی آؤں گا۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ میرے کرمفرما ہیں۔ اس لئے میں اُن سے ضرور ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن آنے کی صحیح تاریخ فی الحال نہیں بتا سکتا۔

دو تین ہفتے ہوئے۔ آپ کی سہیلی پروفیسر ویگی ناسسٹ کا خط وصول ہوا تھا۔ مجھے یہ لڑکی بیحد پسند ہے وہ کتنی اچھی اور مخلص ہے میں نے اُسے اور بوڑھے پروفیسر فراؤ کو جواب لکھ دیا ہے۔

نواب صاحب اور بیگم صاحبہ حمیدہ کو میرا اسلام پہونچا دیجئے اور اُن کو میری دوستی کا یقین دلائیے۔ گو اُن کے لئے یہ بیکار ہے۔ لیکن میں اسے مخلصانہ اور غیر متزلزل سمجھتا ہوں۔

(۲) اقبال اس خط میں بڑی حد تک قنوطی ہو گئے تھے۔ عطیہ بیگم نے اس کے جواب میں ہمدردی اور حوصلہ افزائی کے کلمات لکھے اور اُن کی توجہ دوسری طرف مبذول کرنے کے لئے سر عبدالقادر سے ملنے کا مشورہ دیا۔ اس کے علاوہ پروفیسر فراؤ اور مس ویگی ناسسٹ کا تذکرہ چھیڑ دیا جن سے علامہ اقبال کو بیحد عقیدت تھی اور جن سے انھوں نے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی چنانچہ اگلے خط میں علامہ اقبال کا نظریہ ایک حد تک بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ اور وہ پہلے کی طرح جذبات کی رو میں بہنے کی کوشش نہیں کرتے۔

"لاہور ۔ ۱۷ اپریل ۱۹۰۹ء ۔ مائی ڈیر مس عطیہ ۔ آپ کے ڈھارس بندھانے والے الفاظ کا شکریہ!

آپ کے خط سے مجھے بڑا سکون پہونچا۔

آپ نے لکھا ہے، میں تم سے بہت سوال کرنا چاہتی ہوں۔ تو کیجئے نا۔

آپ جانتی ہیں، میں آپ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھتا اور ایسا کرنا میں گناہ سمجھتا ہوں۔ میں مانتا ہوں میرے خطوط اطمینان بخش نہیں ہوتے لیکن اُن اسباب کی بنا پر جن کا آپ نے گزشتہ خط میں حوالہ دیا ہے۔ ایسا ہونا لازمی ہے۔ بھول جانے کا الزام مجھ پر نہ لگائیے۔ میں بھولتا نہیں ہوں۔ آپ سے صرف اس لئے جواب سننا چاہتا ہوں۔ کہ دیکھوں آپ کس طرح جواب دیتی ہیں۔

کل رات میں جنت میں گیا تھا۔ راستہ میں دوزخ کے دروازہ سے ہو کر گزرنا پڑا۔ میں نے اس مقام کو بیحد سرد پایا۔ جب میں نے حیرت کا اظہار کیا تو لوگوں نے مجھے بتایا کہ یہ مقام اپنی ذات میں بیحد سرد ہے۔ لیکن بعد کو بہت زیادہ گرم ہو جائے گا۔ کیونکہ ہر شخص دنیا سے اپنی آگ اپنے ساتھ لائے گا۔ چنانچہ میں بھی اس ملک میں، جہاں کوئلہ کی کانیں یوں بھی کم ہیں، زیادہ سے زیادہ دہکتا ہوا کوئلہ جمع کرنے کی فکر میں ہوں۔

چیف کورٹ کے بار روم میں عبدالقادر سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ مگر عرصہ سے آپ کے متعلق کوئی گفتگو نہیں ہوئی اب میں دوسروں سے بات چیت نہیں کرتا۔ میری اپنی ذات پریشان خیالات کی کان ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ خیالات میری روح کے گہرے اور تاریک سوراخوں سے سانپوں کی طرح نکلتے چلے آرہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں سپیرہ بن جاؤں گا۔ گلی گلی گھوما کروں گا۔ اور شوقین بچوں کے گروہ میرا تعاقب کریں گے۔

یہ خیال نہ کیجئے۔ کہ میں قنوطی ہوں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ مصیبت میں انتہائی لذت ہے۔ میں اپنی بدنصیبی سے محظوظ ہوتا ہوں اور اُن لوگوں پر ہنستا ہوں جو اپنے آپ کو خوش سمجھتے ہیں۔ آپ نے دیکھا، میں کس طرح اپنی مسرت کے سامان فراہم کر لیتا ہوں۔ چند دن ہوئے مجھے مس ویلی نامسٹ کا ایک خط ملا تھا۔ اب کہ جب انھیں خط لکھوں گا۔ تو وہ دن یاد دلاؤں گا جب آپ بھی جرمنی میں تھیں۔ آہ! وہ دن اب واپس نہیں آئیں گے وہ آج کل اپنے گھر "ہیل برانی" میں ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے اب پروفیسر فراؤ کی امداد کے لئے ہیڈل برگ آگئی ہوں گی، اطمینان رکھئے۔ وہ خیریت سے ہیں۔ میں اپنی ژولیدہ نگاری کے لئے معافی خواہ ہوں۔ ہر لمحہ اپنے ساتھ ایک نیا خیال لاتا ہے۔ اگر آپ کو میرے خط میں تسلسل نہ ملے تو معاف کر دینا۔

اُستانی کے بارے میں یہ ہے کہ آج انجمن حمایت اسلام کے زنانہ مدارس کے مہتمم کی معرفت مجھے ایک درخواست ملی ہے۔ میں اس خاتون سے خط و کتابت کرنے کے بعد نتیجہ سے آپ کو مطلع کروں گا لیکن یہ بتا دیجئے کہ اُسے کسی پبلک گرلز اسکول میں پڑھانا ہوگا؟ یہ بھی لکھئے کہ جنجیرہ میں پڑھانا ہوگا یا بمبئی میں میرے بڑے بھائی کا بمبئی سے ۱۲ میل کے فاصلہ پر ایک جگہ تبادلہ ہو گیا ہے۔ وہ عنقریب روانہ ہو جائیں گے۔

"آبزرور" کے دو پرچے روانہ کر رہا ہوں، امید ہے وہ آپ کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ نواب صاحبہ بیگم صاحبہ

آپ کا مخلص - اقبال

کی خدمت میں میرا سلام پہونچا دیجئے -

(۳) عطیہ فیضی کا بیان ہے کہ اپریل ۱۹۱۰ء سے جولائی ۱۹۱۱ء تک علامہ اقبال کو جو واقعات پیش آئے - وہ اتنے اندوہناک تھے کہ اُن کی زندگی تلخ ہوگئی - اور وہ زندگی کو پہلے سے بھی زیادہ سختی سے جانچنے لگے - آیا اس کا اُن کے خیالات و افکار پر بھی اثر پڑا - ؟ سرِدست اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ حقیقت ہے - کہ اقبال پہلے سے زیادہ گہرے اور پیچیدہ مسایل کی طرف متوجہ ہوگئے اُن کے والد نے فرمایش کی کہ بوعلی قلندر کے طرز پر ایک مثنوی لکھیں - اس سے اُن میں وسعت نظر پیدا ہوئی اور وہ فلسفیانہ ادب کا پہلے سے زیادہ مطالعہ کرنے لگے - اقبال کا لہجہ اسی دور میں تلخ ہوا ہے - اور اُنھوں نے اپنے خالق سے بھی شکوہ کرنے سے گریز نہیں کیا - اکثر اوقات وہ نطشے اور شوپنہار کے فلسفہ میں پناہ لیتے تھے - اُن کو شیلے اور بائرن سے دلچسپی نہ رہی تھی - اسی رجحان کا عکس اُنکے مندرجہ ذیل مکتوب میں نظر آسکتا ہے :-

لاہور - ۷ جولائی ۱۹۱۱ء - مائی ڈیر مس فیضی - مجھے افسوس ہے کہ آپ کے کرمناموں کا اب تک جواب دے سکا بات دراصل یہ ہے کہ پچھلے دنوں بے حد پریشان رہا - میری بدنصیبی وفادار کتے کی طرح میرا تعاقب کرتی رہی ہے اسلئے مجھے بھی محترمہ بدنصیبی سے محبت ہوگئی ہے - تفصیل پھر کبھی لکھوں گا -

نظموں کی ایک نقل آپ کو بھجوانے میں مجھے خوشی ہوگی، میرے ایک دوست نے میری نظموں کا مجموعہ مجھے عاریتہً دیا ہے میں نے اُسے نقل کرنے کے لئے ایک آدمی رکھ لیا ہے - جب مسودہ مکمل ہوجائے گا تو اُس پر نظر ثانی کر کے اُسے دوبارہ لکھوں گا - تاکہ طباعت کے لئے دیا جا سکے - آپ کو میرا شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ آپ کی خوشی میں میری خوشی ہے البتہ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے - کہ آپ میری اتنی حوصلہ افزائی کرتی رہتی ہیں - آپ میری نظمیں لے کر کیا کریں گی - ؟ یہ میرے دکھی دل کی پکاریں - ان میں آپ مسرت تلاش نہیں کر سکتیں - میں نے اپنے انتساب میں لکھا ہے :-

خندہ ہے بہرِ طلسمِ غنچہ تمہیدِ شکست — تو تبسم سے مری کلیوں کو نامحرم سمجھ
درد کے پانی سے ہے سرسبزیِ کشتِ سمن — فطرتِ شاعر کے آئینہ میں جوہر غم سمجھ

تاہم سوچوں گا کہ اس سلسلہ میں مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟ والد صاحب نے فرمایش کی ہے کہ بوعلی قلندر کے رنگ میں ایک مثنوی لکھوں ... کام بیحد مشکل ہے - تاہم کوشش کر رہا ہوں - شروع کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے :-

نالہ را اندازِ نو ایجاد کن — بزم را از ہائے و ہو آباد کن
آتش استی بزم عالم بر فروز — دیگراں را ہم ازیں آتش بسوز
سینہ را سرمنزلِ صد نالہ ساز — اشکِ خونیں را جگر پر کالہ ساز
پشتِ پا بر شورشِ دنیا بزن — موجۂ بیرونِ ایں دریا بزن"

مجھے نظموں کے انتخاب میں بیحد مشکل پیش آرہی ہے - گزشتہ ۵-۶ برس کے عرصہ میں جتنی بھی نظمیں کہی ہیں وہ نجی حیثیت

رکھتی ہیں۔ اور میرا خیال ہے۔ کہ عوام کو اُن سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اُن میں سے بعض میں نے ضایع بھی کر دی ہیں۔ تاکہ ایسا نہ ہو وہ چھپوالیں، باقی اشعار مجھے بھول گئے ہیں، عدالت سے واپس آنے پر ممکن ہے یاد آجائیں۔ دس بج چکے ہیں مجھے جانا چاہیئے۔ ایک غزل ارسال ہے۔ جو پچھلے دنوں "ادیب" میں شایع ہوئی ہے۔

میں نے اپنے دوست سردار اُمراؤ سنگھ (جن کو آپ جانتی ہوں گی) کو لکھا ہے کہ اُن اشعار کا انگریزی ترجمہ مجھے بھجوا دیں جو میں نے مس گاٹسمین کو مخاطب کر کے کہے تھے۔ مس گاٹسمین شہزادی دلیپ سنگھ کی سہیلی ہے۔ اُس نے مجھے شالامار باغ کے پھول تحفۃً پیش کئے تھے۔ میرے پاس اصل اشعار محفوظ نہیں ہیں تاہم آپ کی خاطر تلاش کروں گا۔

نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں آداب عرض پہونچا دیجئے۔ مخلص - محمد اقبال

ایک اور خط ملاحظہ ہو:-

پرائیویٹ

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کچھ!
کہئے کیا حکم ہے؟ دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

محمد اقبال - بمبئی - ۱۰ ستمبر ۳۱ء

شبلی بی۔ کام - (زمیندار)

(نگار) اقبال کا آخری خط جو صرف ایک شعر پر مشتمل ہے، میری رائے میں کافی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ عطیہ فیضی سے جو خط و کتابت انھوں نے ۹ء میں شروع کی تھی وہ ۲۲ سال کی مدت میں رفتہ رفتہ "فلسفۂ حیات" کے کن حدود تک پہونچ گئی۔ شاعر کی دُنیا میں بسا اوقات اظہارِ حال بھی مستفسرانہ انداز میں کیا جاتا ہے اس لئے جس حد تک مفہوم کا تعلق ہے اس شعر کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن فنی حیثیت سے البتہ اس پر گفتگو ہو سکتی ہے۔

پہلے مصرعہ میں جب جوشِ جنوں یعنی جوشِ دیوانگی کا اعتراف کر لیا گیا تو پھر دیوانہ بننے یا نہ بننے کا سوال باقی ہی نہیں رہتا ہاں اگر یہ کہا جاتا کہ "کہئے کیا حکم ہے دیوانہ رہوں یا نہ رہوں" تو البتہ درست ہو سکتا تھا۔ اور اگر دوسرا مصرعہ بدستور رکھا جائے تو پھر پہلے مصرعہ میں لفظ جنوں نہ ہونا چاہیئے۔ یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا:-

"عالمِ جوشِ محبت میں بھی کچھ ہے روا"

حالانکہ لفظ عالم دونوں صورتوں میں بے ضرورت ہے۔

یہاں وہاں سے

کچھ باتیں کتابوں کی

حال ہی میں شیکسپیر کے ڈراموں کا ایک قدیم نسخہ ۱۵۰۰۰ پونڈ میں فروخت ہوا ہے۔

شیلی (مشہور شاعر) عادی تھا کہ اپنی تصانیف کے بعض پرانے اڈیشنوں کے سرورق پھاڑ پھاڑ کر ناؤ بنایا کرتا تھا اور پھر پھینک دیتا تھا۔ لوگوں نے ان کو جمع کر کے بہت گراں قیمت پر فروخت کیا۔

تیز پڑھنے والوں میں کرنل لارنس کو خاص شہرت حاصل تھی۔ ۶ مہینے میں اس نے ۵۰ ہزار کتابیں پڑھ ڈالیں یعنی روزانہ بیس کتابیں۔

آسکر وائلڈ ایک معمولی ضخامت کا ناول ایک گھنٹہ میں ختم کر دیتا تھا۔

میکالے (مشہور مورخ) بہت جلدی کتاب ختم کر دیتا تھا اور حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اس کے صفحات کے صفحات زبانی پڑھ دیتا تھا۔

دُنیا میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب بائبل ہے جس کے ترجمے کے ۲۰ لاکھ نسخے سالانہ فروخت ہوتے ہیں

Gone with the wind (مشہور ناول) کے نسخے ہر سال ۱۰ لاکھ کی تعداد میں فروخت ہوتے ہیں۔

امریکہ میں ایک کارخانہ جو لوہے کے برتن اور اوزار فروخت کرتا ہے، اپنی مصوّر فہرست جو ایک ہزار صفحات کی ہوتی ہے، ہر سال ۷۰ لاکھ مفت تقسیم کرتا ہے۔

ایک امریکی ناول نگار ونسنٹ رائٹر نے ۵۰ ہزار الفاظ کا ایک ناول لکھا جس میں حرف E اس نے کہیں استعمال نہیں کیا۔ بعض مصنفین نے حرف (A) اور حرف (B) کبھی استعمال نہیں کیا۔ ایک ہکلے شخص کے لئے جس کی زبان سے حرف (S) نہیں نکل سکتا تھا، ایک ایسی کتاب لکھی گئی جس میں یہ حرف بالکل ترک کر دیا گیا تھا۔

سر جیمس بیری (مشہور مصنف) اپنے بعد ڈھائی لاکھ پونڈ چھوڑ گیا اور وکٹر ہیوگو ۳۰ ہزار پونڈ۔ لائڈ جارج کو اپنی ڈایری کی اشاعت سے ایک لاکھ پونڈ ملے۔

شیکسپیر کو زندگی بھر اپنی کتابوں سے ۳۰ پونڈ سالانہ سے زیادہ کبھی نہیں ملا اور ملٹن کی پراڈائز لاسٹ کا معاوضہ اسے صرف ۱۵ پونڈ ملا تھا۔ اس وقت کے مصنفین میں برنارڈ شا اور سورسٹ ماگھام کی آمدنی بہت زیادہ ہے لیکن اس کا صحیح علم کسی کو نہیں۔

Forever Amber کا معاوضہ فلم کمپنیوں نے ۵۰ ہزار پونڈ ادا کیا اور Gone with the wind کا اس سے بھی زیادہ۔

سیٹیوں کی زبان

اگر کوئی کہے کہ سیٹی کے ذریعہ سے بھی گفتگو ہو سکتی ہے تو آپ کو یقین نہ آئے گا لیکن افریقہ کے شمال مغرب میں ایک جزیرہ ہے (گومیرا) جہاں سیٹی ہی سے بات چیت ہوتی ہے اور میلوں کے فاصلہ سے ہو جاتی ہے۔

سالہا سال سے اس جزیرہ کے متعلق یہ خبر سنی جاتی تھی، لیکن اس کی تصدیق نہ ہوئی تھی۔ اب امریکہ کی ایک سیاح خاتون نے جس کا نام مسز اینٹ گسٹ ویری ہے، یہاں کی سیاحت کر کے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ واقعی یہاں کے لوگ سیٹی کے ذریعہ سے بات چیت کرتے ہیں۔

جب یہ خاتون اس جزیرہ میں پہونچی تو سب سے پہلے ایک ہوٹل میں گئی اور کھانا طلب کیا۔ خادمہ نے بڑی زور سے سیٹی بجائی تو یہ بہت گھبرائی۔ خادمہ نے کہا کہ "گھبرائیے نہیں، میں نے اپنے لڑکے کو اطلاع دی ہے کہ آپ کے لئے دودھ جلدی لے آئے" اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی ظاہر کیا کہ عورتیں اچھی سیٹی باز نہیں ہو سکتیں، اگر آپ کو واقعی اچھی سیٹی سننا ہے تو دامنِ کوہ میں جائیے جہاں چرواہے بکریاں چراتے رہتے ہیں۔

یہ خاتون بہت متعجب ہوئی اور جزیرہ کے پریسیڈنٹ کے پاس گئی۔ وہ باتیں کر ہی رہی تھی کہ دفعتاً بڑی زور کی سیٹی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ پریسیڈنٹ نے کہا کہ یہ سیٹی دو چرواہوں کی ہے جنھوں نے مجھے مطلع کیا ہے کہ وہ مجھ سے ابھی ملنا چاہتے ہیں۔

جب دونوں چرواہے پریسیڈنٹ کے پاس پہونچے تو اس خاتون نے ان سے کہا کہ وہ سیٹی کے ذریعہ سے گفتگو کریں چنانچہ انھوں نے یہ گفتگو شروع کی تو کمرہ کی کھڑکیوں کے دروازے ہلنے لگے اور خاتون کو اپنے کان بند کر لینے پڑے۔

مزید امتحان کے لئے اس نے دو پہاڑوں کی چوٹیوں پر جو کئی میل ایک دوسرے سے دور تھے دو چرواہوں کو کھڑا کیا، ایک جگہ خود رہی دوسری جگہ اپنے شوہر کو ساتھ کیا۔ جب دونوں چرواہے اپنی اپنی جگہ پہونچ گئے تو اس نے اپنے ساتھی چرواہے سے کہا کہ دوسرے چرواہے سے کہو کہ وہ میرے شوہر کی ٹوپی اُتار کر زمین پر رکھ دے۔ چنانچہ اس نے یہی بات سیٹی کے ذریعہ سے کہی جس کی تعمیل کی گئی اس کے شوہر نے تصدیق کی۔

اس نے تحقیق کی کہ اس کی ابتدا یہاں کیوں اور کیونکر ہوئی تو ایک بڈھے آدمی نے کہا کہ یہاں کے قدیم باشندے افریقہ سے آئے تھے اور کسی جرم کی سزا میں ان کی زبانیں کاٹ دی گئی تھیں۔ جب وہ کشتیوں میں بٹھا کر دریا کے سپرد کئے گئے تو یہ کشتیاں اس جزیرہ کے ساحل پر آ کر لگیں اور مجبوراً سیٹیوں کے ذریعہ سے انھیں تبادلۂ خیالات کرنا پڑا۔

خاتون نے پوچھا کہ یہ زبان کیونکر سیکھی جا سکتی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے، جو الفاظ آپ زبان سے نکالنا چاہتی ہیں انھیں سیٹی کے ذریعہ سے پیدا کرنے کی کوشش کیجئے۔

ساقی

ہَوا ہے زمزمۂ سازِ بہار اے ساقی
مگر ہَوا کا بھی کیا اعتبار اے ساقی

مرا جنوں نہ اُٹھائے گا تہمتِ مستی
مری نظر ہے ابھی ہوشیار اے ساقی

بجوشِ لالہ و نسریں بہ سیلِ صرصر و باد
ورق ورق ہے کتابِ بہار اے ساقی

یہ دوشِ باد پہ ہیں بدلیوں کے مشکیزے
کہ اُڑ رہا ہے کوئی رود بار اے ساقی

یہ کوہسار کے ماتھے پہ برف کی ہے لکیر
کہ ٹوٹتی ہے رگِ آبشار اے ساقی

یہ برق ہے کہ اُچھلتی ہے نبضِ ابرِ بہار
یہ ابر ہے کہ ترا انتظار اے ساقی

یہ پھول ہیں کہ دہکتی بہار کے "بوسے"
سحاب ہے کہ سلگتا خمار اے ساقی

تری نگاہ کی مایوسیاں ہی کیا کم ہیں،
کسی کا نام نہ لے کر پکار اے ساقی

جو اُٹھ گئے تری محفل سے مسکراتے ہوئے
کچھ ایسے لوگ بھی تھے دلفگار اے ساقی

ارے یہ ٹھوکریں کھاتی نظر کی ویرانی
کدھر کو اُٹھ کے گئے بادہ خوار اے ساقی

ذرا سنبھل کے جلا ساغر و سبو کے چراغ
ہوائے وقت ہے بے اختیار اے ساقی

مری نگاہ کی حرماں نصیبیوں پہ نہ جا
ابھی یہ برق ہے خرمن شکار اے ساقی

حجابِ مستی و مینا اُٹھا تو دوں لیکن
ہوائے وقت نہیں سازگار اے ساقی

وہ دیکھ رات کا سیلاب پھر بلند ہوا
وہ دیکھ صبح کا ٹوٹا حصار اے ساقی

یہ عطر و گل کے سویرے یہ زعفران کے کھیت
یہ کیا ہے چشمکِ برق و شرار اے ساقی

طنابِ ٹوٹ گئی آہ کتنے خیموں کی،
یہ قافلے ہیں کدھر رہسپار اے ساقی

یہ کس بہشت کی وادی میں سوگوار ہے حسن
سیاہ پوش ہیں کتنے نگار اے ساقی

یہ کون دیس ہے جس کے سیاہ مست غزال
ہیں اپنے دشت میں بیگانہ وار اے ساقی

نہ دیکھ پیار کی نظروں سے ہم نہ کہتے تھے
لہو رُلائے گا اک دن یہ پیار اے ساقی

کہاں وہ تبکدۂ ہند اور کہاں گجرات
مرے صنم نہ مرا کردگار اے ساقی

یہ میہوال کی وادی، یہ سوہنی کی زمیں
یہ حُسن و عشق کا اُجڑا دیار اے ساقی

قدم قدم پہ اندھیرا، نظر نظر میں چراغ!!
عجیب غم ہے، غمِ انتظار اے ساقی!!

یہ سوچتا ہوں کہاں جاؤں کس سے بات کروں
نہ میرا شہر نہ میرا دیار اے ساقی

مگر مری یہ دعا ہے کہ اِس قیامت میں
تجھے خدا نہ کرے سوگوار اے ساقی

رُکا ہے اور نہ رُکے گا حوادثات کا سیل
خدا کے واسطے گیسو سنوار اے ساقی

خدا کرے کہ مہکتی ہوئی بہاروں میں
وہ زلفِ ناز رہے مشکبار اے ساقی

خدا کرے ترا معصوم و سادہ کار شباب
گل و سمن سے رہے ہم کنار اے ساقی

خدا کرے نہ چھٹے تیری آنکھ کا کاجل
وہ چشمِ ناز نہ ہو اشک بار اے ساقی

خدا کرے مری بر باد زندگی کے حضور
تری نگاہ نہ ہو شرمسار اے ساقی

تری نگاہ سلامت تری نگاہوں پر
ہزار مستی و صہبا نثار اے ساقی

خدا کرے کہ ترے میکدے پہ ہوتا حشر
نزولِ رحمتِ پروردگار اے ساقی

(پروفیسر) شور

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے

معجون عنبری یہ دوا دُنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اسکے مداح موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھاتے ہیں، اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں۔ اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اس کو مثل آبِ حیات کے تصور فرمائیے اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی۔ اسکے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے سے متلق تھکن نہ ہوگی۔ دو دار خساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی، یہ دوائی نہیں ہے بلکہ ہزاروں مایوس العلاج اس کے استعمال سے بامراد بن کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کہ آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے۔ القصہ اسکی صفت تحریر میں نہیں آسکتی۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دُنیا بھر میں نہیں۔

قیمت فی شیشی ۲۴ خوراک چار روپیہ (للہ ر)

(نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دوا خانہ مفت منگائیے۔ میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہئے۔ میری ۳۰ سالہ شہرت پر غور فرمائیے۔

پتہ:- **حکیم ثابت علی پنج زبان خوش کلام**

(عالم مثنوی مولانائے روم صاحب)

محمود نگر نمبر ۳ لکھنؤ - یو - پی

مرزا شوق لکھنوی کا تنقیدی مطالعہ

(از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی)

مرزا شوق، جانِ عالم واجد علی شاہ کے اُس لکھنؤ کا شاعر ہے، جہاں ہر منظر جنت نگاہ اور ہر گوشہ بساط، دامان باغباں بنا ہوا تھا۔ نظارہ جمال بھی تھا اور شوق وصال بھی۔ جامِ بلّور بھی تھا اور زہرہ صبح بھی۔ صراحیِ ناب بھی تھی اور سفینۂ غزل بھی۔ اس کا تنقیدی مطالعہ نہ صرف لکھنوی ادب کے محرکات اور میلانات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے بلکہ اس تہذیبی ماحول کو جاننے کے لئے بھی، جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکم قضا کو جامِ شراب کی گردش سے پھیر دیا گیا ہے اور شام و سحر کی یہ رنگینیاں قایم ہو کر رہ گئی ہیں۔

قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ

ملنے کا پتہ:- **دفتر نگار لکھنؤ**

اُردو

سرشار کا حسن داستاں ہے اُردو
محروم و فراق کا بیاں ہے اُردو
اُردو کو ملیچھ کیوں سمجھتے ہو تم،
چکبست و سرور کی زباں ہے اُردو

اے اہلِ وطن! یہ داستاں اپنی ہے
اپنی ہے یہ رود و فغاں اپنی ہے
کیوں اس کو مٹا رہے ہو اے دیوانو!
غیروں کی نہیں ہے یہ زباں اپنی ہے

تہذیب سے دعوئے محبت کیوں ہے
نعروں میں "تحفظِ ثقافت" کیوں ہے
دعوے یہ اگر فقط دکھاوے کے نہیں
پھر اپنی زبان سے یہ نفرت کیوں ہے

اُردو سے یہ فقدانِ محبت کیوں ہے
اپنی تہذیب سے عداوت کیوں ہے
تھے ہند کا فخر غالب و داغ و انیس،
پھر اُن کی زبان سے یہ نفرت کیوں ہے

اُردو کو مٹاؤ گے تو مٹ جائے گی
خوشبو یہ فضا کو پھر نہ مہکائے گی
لیکن یہ بھی خبر ہے اے دیوانو!
تہذیب میں کس قدر کمی آئے گی

اُردو ہے فقط زبان، کہسار نہیں،
اک موجِ شمیم ہے یہ تلوار نہیں
مشکل نہیں اُردو کا مٹانا لیکن،
کیا اپنے تمدن سے تمھیں پیار نہیں،

پھولوں کو نہ پیروں سے لتاڑو، سنبھلو
پودوں کو نہ اس طرح اُکھاڑو، سنبھلو
اک بار جو اُجڑا تو نہ پھر پھولے گا
خود اپنا گلستاں نہ اُجاڑو، سنبھلو

جگن ناتھ آزاد

نگار کے پرانے فائل

جولائی سنہ ۳۰ء سے دسمبر سنہ ۳۰ء تک مجلد = چار روپیہ
جنوری سنہ ۳۶ء سے دسمبر سنہ ۳۶ء تک مجلد = چار روپیہ
جنوری سنہ ۳۷ء سے دسمبر سنہ ۳۷ء تک مجلد = آٹھ روپیہ
جنوری سنہ ۳۸ء سے دسمبر سنہ ۳۸ء تک مجلد = آٹھ روپیہ
جنوری سنہ ۳۹ء سے دسمبر سنہ ۳۹ء تک مجلد = آٹھ روپیہ
سالنامہ سنہ ۳۲ء و سنہ ۳۵ء ایک ہی جلد = چار روپیہ
سالنامہ سنہ ۴۳ء ---------- = ایک روپیہ

ا-م - ذریعہ دفتر نگار - لکھنؤ

غزل :- (مہر اکبر آبادی - ایم - اے)

مرے غم سے واقف ہوا اِک زمانہ — نہ آیا اُنھیں مجھ سے دامن بچانا
میں اب خود کو دھوکے سے دینے لگا ہوں — یہی تھا جواب فریبِ زمانہ
تصادم نگاہوں کا وہ - توبہ توبہ — اِدھر کا اُدھر ہوگیا اِک زمانہ
تبسم میں یوں غم کو میں نے چھپایا — کسی نے مرے غم کو غم ہی نہ جانا
مجھے مہرِ رہزن کا کھٹکا نہیں ہے — مجھے خود کو ہے رہبروں سے بچانا

ناز بریلوی :-

اس طرح سُن رہا ہوں میں ناصح کی گفتگو — جیسے سمجھ میں عشق کا انجام آگیا

پھر سمجھ لیں گے کبھی صیاد آدابِ قفس، — آکے بیٹھے ہیں ابھی پھولوں بھری محفل سے ہم

میں واعظ کیا کروں آنکھوں میں ساقی کی مروت ہے — وگرنہ ہوش جیسی چیز کو کھویا نہیں جاتا

مجھے خود اپنی وفاؤں پہ اعتماد نہیں — کہاں سے لاؤں یقیں حسن بدگماں کے لئے

چھوڑتی جانے کہاں گردشِ ایام مجھے — وہ تو یہ کہئے کہ منزل پہ ہوئی شام مجھے
بہکی بہکی یہ ہوائیں، یہ جنوں خیز بہار — کوئی کھینچے لئے جاتا ہے تہ دام مجھے
نام سے تیرے کریں گے ابتدائے شرحِ غم — آج اک عنوانِ افسانہ سمجھ میں آگیا

مشیر جھنجھانوی :-

گھبرا کے آنہ جائے کہیں لب پہ تیرا نام — اے حسنِ دل فریب نہ لے مجھ سے انتقام
دشت و صحرا میں بھی آزاد نہیں جوشِ جنوں — دل تڑپ اُٹھتا ہے اب تک مرا زنداں کے لئے
عالمِ اضطراب میں اکثر، — لبِ مجبور پر ہنسی آئی
اُف یہ محجوب نگاہیں یہ عرق ریز جبیں — اب گوارہ ہے شکستِ دلِ ناکام مجھے

کلام شمیم نعمانی :-

چھٹ گیا دامنِ امیدِ تماشا ہم سے — تو نے کیوں پردہ کیا جانِ تمنا ہم سے
تجھ سے ملنے کی تمنا! ترے ملنے کی امید! — یہ تو کفرانِ محبت ہے، نہ ہوگا ہم سے!
چشمِ ساقی نے شمیم آج تلافی کر دی
عینِ مستی میں گرا ساغرِ صہبا ہم سے

مطبوعات موصولہ

جلوۂ صد رنگ

مجموعہ ہے جناب حبیب احمد صاحب صدیقی ایم - اے کی غزلوں اور نظموں کا۔ جناب صدیقی کی شاعرانہ حیثیت سے بہت کم لوگ واقف ہیں، کیونکہ وہ محفل طرازی و شاعر پیشگی دونوں سے بیگانہ ہیں اور انھیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ ان کی شاعری ایسی جنس عام نہیں جس کا خریدار ہر جگہ مل جائے ایک صاحب کا قول ہے کہ:۔ "شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا" لیکن صدیقی صاحب کے یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے کیونکہ ان کو شاعری کی طرف جس چیز نے زیادہ متوجہ نہ ہونے دیا وہ ڈپٹی کلکٹری ہی تھی۔

وہ بہ سلسلۂ ملازمت گورکھپور، کانپور اور لکھنؤ مختلف مقامات میں رہے۔ اور جہاں رہے فرصت کے اوقات میں کچھ نہ کچھ شاعری بھی کی لیکن مشاعروں سے ہمیشہ علیحدہ رہے۔

وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے بہت کم آمیز و کم سخن انسان ہیں اور اُن جیسے صاف ستھرے اور سنجیدہ ذوق کے لوگ اکثر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر جگہ ان کا حلقۂ سخن بہت محدود رہا اور اخباری و اشتہاری دُنیا کی طرف جانا انھوں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔

بہت کم شاعر ایسے ہیں جن کی فطرت و شاعری میں اس قدر ہم آہنگی پائی جاتی ہے جتنی صدیقی صاحب کے یہاں نظر آتی ہے۔ وہ بڑے وسیع المطالعہ مفکرانہ دماغ کے انسان ہیں اور یہ خصوصیت ان کے ہر ہر شعر سے واضح ہے، ان کی شاعری یکسر جذبات کی شاعری ہے۔ لیکن ایسے شخص کے جذبات جو اپنے تاثرات سے مغلوب ہو کر عقل و حواس کھو دینے کا قایل نہیں ہے۔ ان کے کلام کی وہ خصوصیت جو بہت کم کہیں اور پائی جاتی ہے، ایجاز ہے نہایت لطیف و پاکیزہ اور بڑا Suggestive

پروفیسر مجنوں نے اس کتاب کے پیش لفظ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:۔ "ہیجان جذبات پر فکر و تامل کی نگاہ اور پھر سوچ سمجھ کر جچے تلے انداز میں وقار و متانت کے ساتھ اس کا اظہار صدیقی کی شاعری کی عام خصوصیت ہے"۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اب تو جو شے ہے مری نظروں میں ہے ناپایدار — یاد آیا ہے کہ غم کو جاوداں سمجھا تھا میں

دھوکا سا ہوا منزلِ مقصود کا اکثر — ہیں دیر و حرم کتنے تری راہگذر میں

مجھ کو احساس رنگ و بو نہ ہوا — یوں بھی اکثر بہار آئی ہے

اس وفور بے دلی پر بھی جیے جاتا ہوں میں — کیا خبر یہ زندگی کو آسرا دیتا ہے کون

خیال میں بسا ہوا ہے آشنا کے روپ میں — وہ دلنواز اجنبی کہ جس سے گفتگو نہیں

کتاب کی طباعت و کتابت وغیرہ بھی نہایت پاکیزہ ہے۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔
بھگوتی سہائے ہتکاری وکیل ۱۵۶ سروپ نگر کان پور۔

۵۷ء کے ہیرو تصنیف ہے سیدہ انیس فاطمہ بریلوی کی جس میں انھوں نے حضرت محل، جنرل بخت خاں اور جنرل محمود خاں کے کارنامے پیش کئے ہیں۔ یہ تینوں ہستیاں تاریخ اودھ کے بالکل آخری دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ حضرت محل، واجد علی شاہ کی بیوی تھیں، جنرل بخت خاں بریلی کے رہنے والے تھے اور محمود خاں روہیلہ پٹھان اور ان تینوں نے ۵۷ء کے انقلاب میں فرنگیوں کے خلاف نمایاں حصہ لیا تھا۔ اور اسی لئے سیدہ فاطمہ نے ان کو ۵۷ء کا ہیرو کہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جنرل بخت خاں اور جنرل محمود خاں کے کارنامے فاضل مصنفہ نے بڑی خوش اسلوبی سے لکھے ہیں، اور اس کی جتنی داد دیجائے کم ہے۔ حضرت محل کے متعلق البتہ ان کی بعض تحقیقات سے ہمیں اختلاف ہے۔

حضرت محل کو ۵۷ء کی جنگ آزادی کی ہیروئن قرار دینا صحیح نہیں، کیونکہ وہ خوشی سے اس میں شریک نہ ہوئی تھیں بلکہ انھیں مجبور کیا گیا کہ اپنے نابالغ بیٹے برجیس قدر کو تخت نشین کریں۔ لکھنؤ میں جو شکست انگریزی فوج کو ہوئی تھی اسوقت تخت اودھ خالی تھا اور فوج کا کوئی سردھرا نہ تھا۔ جب ۵۸ء میں دوبارہ حملہ کیا تو حضرت محل نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر معہ اپنے بیٹے برجیس قدر کے نیپال بھاگ گئیں

ایک جگہ انھوں نے وزیر علی خاں کی تاریخ وفات ۱۸۰۶ء لکھی ہے، حالانکہ صحیح تاریخ ۱۸۱۷ء ہے۔ وزیر علی خاں کے متعلق انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان میں سیاسی شعور نام کو نہ تھا، حالانکہ وہ بہت ہر دلعزیز تھے اور ان کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ وہ انگریزوں کے اشارے پر نہیں چلتے تھے۔

ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ سعادت علی خاں نے دو کرور کی رقم جمع کی تاکہ اس سے اپنے بزرگوں کا کھویا ہوا ملک کمپنی سے واگزاشت کرائیں۔ یہ بھی صحیح نہیں انھوں نے اس غرض کے لئے سترہ کرور روپیہ جمع کیا تھا لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی، نصف روپیہ ان کے بیٹے غازی الدین حیدر کی رسم تاجپوشی میں صرف ہو گیا اور باقی نصیر الدین حیدر نے اڑا دیا۔

صفحہ ۱۲۰ پر انھوں نے وزیر علی خاں کو آصف الدولہ کا بڑا لڑکا ظاہر کیا ہے، حالانکہ آصف الدولہ کے کوئی بیٹا نہ تھا وزیر علی خاں کو متبنی کر لیا تھا۔ صفحہ ۱۹ پر انھوں نے نواب سعادت علی خاں کا بڑا بیٹا محمد علی شاہ (نصیر الدولہ) کو بتایا ہے۔ حالانکہ یہ تیسرے بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے غازی الدین حیدر تھے اور دوسرے نواب احمد علی خاں شمس الدولہ۔

بجز ان چند فروگزاشتوں کے پوری کتاب تاریخی حیثیت سے بڑا وزن رکھتی ہے اور اس لحاظ سے کہ ۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والی ان تین ہستیوں کا ذکر کسی نے اس اہتمام سے نہیں کیا۔ کتاب بہت قابل قدر ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ مصنف علیگڈھ۔

دیوان غالب مع شرح | جناب جوش ملسیانی کی تالیف ہے اس مقصد کے ساتھ کہ وہ اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ

کے کام آئے۔ شروع میں ایک بسیط مقدمہ بھی شامل ہے جس کے مطالعہ سے غالب کی شاعری کی اہمیت کا اجمالی علم پوری طرح حاصل ہو جاتا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ کلام غالب کے جس اڈیشن کو سامنے رکھ کر یہ شرح لکھی گئی ہے وہ بہت غلط تھا اور مولف نے ان غلطیوں کو دور کئے بغیر شرح لکھنے کی کوشش کی اس لئے بعض اشعار متن و شرح دونوں حیثیت سے بالکل بے معنی ہو گئے ہیں۔ تاہم جوش ملسیانی کی یہ کوشش قابل داد ہے۔ طباعت و کتابت بہت صاف ہے۔ قیمت پانچ روپیہ۔

ملنے کا پتہ:۔ آتما رام اینڈ سنز کشمیری گیٹ دہلی۔

مرزا شوق لکھنوی

یہ کتاب تنقیدی مطالعہ ہے نواب مرزا شوق لکھنوی کی بہار عشق اور زہر عشق کا۔ جسے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔

پروفیسر فاروقی ادب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے ہیں اور انھوں نے تمام اُن آزادیوں کو سامنے رکھ کر جو فن تنقید کے جدید اصول میں ضروری سمجھے جاتے ہیں، ان مثنویوں پر اظہار خیال کیا ہے اور ایسے دلکش انداز میں کہ مثنویوں سے قطع نظر یہ کتاب بجائے خود نہایت دلچسپ ادبی تالیف ہو کر رہ گئی ہے۔ ابتدا میں نیاز فتحپوری کا مقدمہ ہے، اس کے بعد جوش کا دیباچہ، اور اسی کے ساتھ مولانا حالی، احسن لکھنوی، مجنوں گورکھپوری اور پروفیسر سرور کی مختصر رائیں بھی ان مثنویوں کے متعلق دیدی گئی ہے۔ طباعت و کتابت وغیرہ بہت پاکیزہ ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر نگار لکھنؤ

چھان بین

مجموعہ ہے جناب اثر لکھنوی کے پندرہ انتقادی مقالات کا جو اس سے قبل ملک کے مشہور رسایل و جرایہ میں شایع ہو چکے ہیں۔ جناب اثر نہ صرف شاعر بلکہ نقاد کی حیثیت سے بھی ملک میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور جس حد تک فن شعر اور زبان کا تعلق ہے ان کی معلومات بہت وسیع ہیں۔

اس مجموعہ میں چکبست، فراق، اصغر، احمد ندیم قاسمی، محمد صادق خاں اختر کی شاعری پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور اقبال کے انداز بیان پر بھی ایک پاکیزہ مضمون نظر آتا ہے۔ غالب کے بعض اشعار کے مطالب بھی انھوں نے ایک مقالہ میں تحریر فرمائے ہیں، جس سے جناب اثر کی بالغ نظری اور پاکیزگی ذوق کی پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے اور طباعت و کتابت کے لحاظ سے دیدہ زیب ہے۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ دانش محل لکھنؤ۔

کارنامۂ اسلام

تالیف ہے میاں بشیر احمد کی جو ماہنامہ ہمایوں کے مالک اور ادبی دنیا میں کافی شہرت رکھتے ہیں اور اب ترکی میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے مامور ہیں۔ میاں صاحب لاہور میں باغبانپورہ کے اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس نے جسٹس شاہ دین ہمایوں ایسے افراد پیدا کئے۔ میاں صاحب انھیں کے صاحبزادے ہیں اور اپنے والد محترم کی یادگار ہی میں انھوں نے ہمایوں جاری کیا تھا۔ میاں بشیر احمد ابتدا ہی سے پاکیزہ ذوق ادب رکھتے ہیں اور ان کی زندگی کا اکثر حصہ مطالعہ ہی میں صرف ہوا ہے۔ اخیر میں انھوں نے ادب کے ساتھ سیاست کو بھی شامل کر لیا اور مسلم لیگ کے بڑے

سرگرم ممبر ہو گئے۔ — یہ کتاب اُن کی اسی سیاسی دور کی یادگار ہے اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے تاریخ اسلام کے تمام اہم واقعات کو یکجا کر دیا ہے — اس کتاب میں ظہور اسلام سے لیکر قیام پاکستان تک کے تمام اہم واقعات کو انھوں نے یکجا کر دیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے اس کتاب سے بڑی مدد مل سکتی ہے ایک باب قاید اعظم کی حیات اور ان کے کارناموں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

یہ کتاب مکتبۂ ہمایوں، ۳۲ لارنس روڈ لاہور سے مل سکتی ہے۔ قیمت ساڑھے تین روپیہ۔

نغمۂ الوہیت اُردو ترجمہ ہے بھگوت گیتا کا جسے حسن الدین احمد صاحب نے بہت صاف و سلیس زبان میں کیا ہے۔ ابتدا میں پنڈت سندر لال کا مختصر سا مقدمہ بھی شامل ہے جس میں انھوں نے اس ترجمہ کو بہت سراہا ہے۔ بھگوت گیتا کا شمار چوٹی کی مذہبی کتابوں میں کیا جاتا ہے اور ہر اس شخص کو جو مذہبی مباحث سے دلچسپی رکھتا ہے، اس کا مطالعہ ضروری ہے۔

مسلمانوں میں بہت کم ایسے ہیں جو اس کی اہمیت سے واقف ہوں، اس لئے ضرورت تھی کہ اس کا ترجمہ کر کے مسلمانوں کے سامنے بھی پیش کیا جاتا۔ اس کی قیمت تین روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ ادارۂ علمیہ، ۳۲۱، اعظم پورہ حیدر آباد دکن۔

بہشت بینی پرشاد سنگھ صاحب کی تصنیف ہے جو یوپی کے مشہور کانگرسی رہ چکے ہیں، اس میں انھوں نے کانگرس کے صحیح مقاصد کو مختلف عنوانوں سے پیش کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اگر ان مقالات کی روح کو سامنے رکھ کر ہندو مسلمان اس پر عمل کریں تو ہندوستان بیشک جنت نشان ہو سکتا ہے۔

کتاب بہت صاف و سلیس اُردو میں لکھی گئی ہے جسے ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ صدیق بک ڈپو۔ لکھنؤ۔

صراط الحمید مولانا محمد الیاس برنی کا سفر نامہ ہے جو انھوں نے مقامات مقدسہ کی زیارت کے سلسلہ میں تحریر کیا ہے اس میں عراق، شام، فلسطین و حجاز کے تمام مقدس مقامات کا ذکر ہے اور یہ ذکر صرف سیاحانہ و زایرانہ نہیں بلکہ مورخانہ بھی ہے۔ اس میں نہ صرف ان تمام مراحل کا ذکر ہے جن کا ایک زایر حرمین کے لئے جاننا ضروری ہے بلکہ یہ دراصل ایک تاریخی تصنیف ہے جو یوں بھی اپنی اہمیت جدا رکھتی ہے۔ اس کتاب سے الیاس صاحب کے جس ذوق و شوق اور والہانہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے قلوب مذہب سے زیادہ عشق و محبت کے گھایل ہیں۔ اس کتاب میں حاجیوں کے لئے اتنی مفید تفصیلی معلومات درج ہیں کہ وہ اس کی مدد سے آپ سب کچھ کر سکتے ہیں اور ان کو کسی دوسرے گائیڈ کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔ مقامات مقدسہ کی تصاویر نے اس کتاب کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے۔ اس کی دو جلدیں ہیں اور دونوں کی قیمت چار روپیہ ہے۔ طباعت، کتابت نہایت پاکیزہ ہے اور کاغذ سفید، دبیز چکنا استعمال کیا گیا ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی لکھنؤ۔

مکتوباتِ نیاز

تین حصوں میں

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جنکے سامنے خطوطِ غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوئی ہے قیمت حصہ اول و دوم فی حصہ تین روپیہ حصہ سوم چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخیل، اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی جس میں ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں۔

۱۔ چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲۔ ادیان کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت:۔

ایک روپیہ علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام انشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین۔

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ادیان و اخلاق و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے۔ پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت ڈھائی آنہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایکبار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ۱۔

ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جنمیں خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے مثلاً مومن، نظیر، غالب، صفی، نظیر اکبرآبادی، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔ قیمت حصہ اول بعہ حصہ دوم للعہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری، فروری ۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۲۲ء سے لیکر ۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات اور انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے، اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری، مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے

قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری ۴۷ء

اس سالنامہ کا نام "ماجد ولین نمبر" ہے جس میں ایک ہمشکل فرانسیسی دیب کی ایک شاہکار تربیجڈی کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے ادیب اور جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جنوری، فروری ۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے درخشاں اور رواں کارناموں کو نہ بھول جائیں جن پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کئے گئے ہیں اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانگاری کسے کہتے ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرت اشتہار

	ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھ صفحہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے۔ "منیجر"

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے پاکستان کے اندر چھ روپیہ ششماہی جاری نہیں ہو سکتا۔ سالانہ بیرون ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے، ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔ "منیجر"

جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

مطبوعہ نگار پریس لکھنؤ (ایڈیٹر و پبلشر ایس حسین)